رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۹ عدد ۳ دسمبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	دسمبر ۱۹۶۲ء	جلد ۵۹

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہندوستان کی تقسیم کوئی ایسی خوش کن بات نہ تھی جسے اس ملک کے رہنے والوں نے ہنسی خوشی گوارا کیا تھا۔ یہ تقسیم ایک ناگزیر ضرورت کے تحت عمل میں لائی گئی اور اس سے اس ملک کے بسنے والوں کو مختلف قسم کے مصائب و شدائد کا سامنا کرنا پڑا۔ تقسیم کے وقت درندگی کے بے شمار ایسے واقعات سامنے آئے کہ اگر انہیں بھیڑیوں کی طرف بھی منسوب کیا جاتے تو وہ شرم کے مارے اپنی گردنیں جھکا دیں اور ان الزامات سے اپنی برات کا اعلان کریں۔

تقسیم کے نتیجے میں یہ پیش آنے والے حوادث کوئی غیر متوقع نہ تھے جس انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے معمولی سمجھ بوجھ دے رکھی تھی اور جو حالات کی رفتار کا ذرا آنکھیں کھول کر مطالعہ کر رہا تھا وہ اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھا کہ اس تقسیم کے لیے لوگوں کو آگ و خون کے سمندر میں سے گزرنا پڑے گا اور اس کے بعد بھائی بھائی سے جدا ہو گا، باپ اور بیٹے کے درمیان ملاپ ممکن نہ رہے گا، ماں بچوں کی جدائی میں آہ جگر سوز کھینچے گی اور بچے ماں کی شفقت سے اُس کی زندگی ہی میں محروم ہو جائیں گے۔ بہنیں اپنے بھائیوں کے چہرے دیکھنے کے لیے ترسا کریں گی۔ اور بھائی بہنوں کے فراق میں آنسو بہایا کریں گی۔ اس کے علاوہ لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑنے پڑیں گے اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے سارے تعلقات عملاً ختم ہو جائیں گے۔

اس ملک کے عوام نے ان سب روح فرسا حالات کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی تقسیم ملک کے لیے اس بنا پر آمادگی کا اظہار کیا کہ چلیے ایک مرتبہ کی مصیبت برداشت کر لینے کے بعد تو حالات میں سکون پیدا ہو گا اور یہ آئے دن کی سر پھٹول اور باہمی کشمکش دفن ہو جائے گی۔

ایک لمبے تجربے کے بعد مسلمانوں نے اسی حقیقت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اس ملک کی اکثریت جن اجتماعی تخیلات کی پرستار ہے اور جنہیں وہ ملک پر مسلّط کرنا چاہتی ہے وہ مسلمان رہتے ہوئے انہیں قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے بجائے آپس میں دست و گریباں ہونے کے اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ ہندوستان کے جن حصّوں میں ہندو اکثریت میں ہیں وہ حصّہ انہیں دے دیا جائے اور جن حصّوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے اُن میں ان کی بالادستی تسلیم کر لی جائے۔ اور اس طرح دونوں قومیں اپنے اپنے حصّوں میں اپنے تصوّرات کے مطابق اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔ جن علاقوں میں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیّت میں اُن حصّوں میں ہندو اقلیّت کے جان و مال کی حفاظت اور پاسبانی کا ذمّہ اٹھائیں اور جن حصّوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس مقدس فرض کو مسلمان ادا کریں۔

تقسیم کے وقت عام احساس یہی تھا کہ جس فارمولے پر ہندو اور مسلمان دونوں متفق ہو گئے ہیں وہ فارمولا بہت جلد ہی حالات کو بہتر بنا دیگا۔ دلوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جو جذبات موجود ہیں وہ تھوڑی مدت گزر جانے کے بعد ختم ہو جائیں گے اور انکی جگہ محبت اور آشتی کے احساسات موجزن ہوں گے اور اس طرح ماضی کی تلخیاں بھول کر دونوں قومیں مستقبل میں اپنی قومی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی راہ نکالیں گی اور یہ دونوں ممالک جن کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں وہ ایک دوسرے کے دمساز رفیق اور مخلص مددگار ثابت ہوں گے۔

مسلمانوں نے ارضِ پاکستان میں اقلیتوں کے جان و مال کی پوری طرح حفاظت کی اور اُن کے ساتھ اس قدر فیاضانہ سلوک کیا کہ دنیا کی شاید ہی کوئی اکثریت اپنی اقلیت کے ساتھ اس قدر فیاضی کا معاملہ کر سکے۔ مغربی پاکستان میں تو غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے لیکن مشرقی پاکستان میں ہندو زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہیں اور توازنِ اقتدار عملاً انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس شخص یا

گروہ کو آگے لانا چاہتے ہیں بڑی آسانی کے ساتھ لے آتے ہیں اور پھر اُس مہرے کو بساطِ سیاست پر اپنی منشا اور مرضی کے عین مطابق گھماتے پھرتے ہیں۔

گذشتہ پندرہ برسوں میں کبھی ایک مرتبہ بھی ہندوؤں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی گئی، اور اگر کسی وقت اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس ہوا تو حکومت اور عوام دونوں نے اس رجحان کو بڑی سختی کے ساتھ دبا دیا۔

مسلمان اگرچہ مذہب سے کافی حد تک بیگانہ ہو چکا ہے، وہ اپنے اندر سیرت و کردار کا وہ اعلیٰ معیار بھی نہیں رکھتا جو اُس کے آباء واجداد رکھتے تھے۔ اس کے اندر تعصب، تنگ نظری اور خود غرضی کے جراثیم کافی مقدار میں پرورش پا چکے ہیں لیکن وہ اس گئی گذری حالت میں بھی بہرحال اس بات کو نہیں بھولا کہ اُسے دنیا میں کمزوروں اور بے کسوں کو ستانے اور ان پر دستِ ظلم دراز کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ ان کی حفاظت اور دادرسی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس بنا پر اُس کا یہ فرض ہے کہ جن لوگوں کے جان و مال کا اُسے پاسباں بنایا گیا ہے وہ بُرے سے بُرے حالات میں بھی انہیں ہر قسم کے ظلم و ستم سے جان کی بازی لگا کر بھی بچانے کی کوشش کرے۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہندوؤں کے ہاں شرافت اور انسانیت دوستی کے سارے چشمے سُوکھ گئے ہیں لیکن ہم یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس قوم کی عظیم اکثریت اُن اقدار کی علمبردار نہیں رہی جو دنیا میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ سکّوں کی جھنکار، روپوں کی ریل پیل، کارخانوں کی بہتات اور مالِ تجارت کی فراوانی سے قومیں زندگی کی قوت اور توانائی حاصل کرتی ہیں اس لیے وہ انہیں بڑھانے اور ترقی دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن وہ شاید تاریخ کے اس سبق کو یکسر بھول گئے ہیں کہ اس کائنات میں قوموں کے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے یہ بات بھی انتہائی ضروری ہے کہ وہ قومیں

خونریزی، سفاکی، زیردست آزاری کے دیوتا ثابت ہونے کی بجائے مظلوموں اور بے کسوں کے لیے ڈھال ثابت ہوں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور خصوصاً وہ لوگ جو اُن کے دستِ نگر ہیں اُن کی جان و مال، عزت و آبرو، اُن کے مذہب، اُن کی معاشرتی روایات اور اُن کے تہذیب و تمدن کی پوری پوری حفاظت کریں۔ خدا نے آج تک اُس قوم کو کبھی بھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جس کے اندر رحم اور انصاف کا جذبہ موجود نہ ہو۔ کیونکہ یہی دو جذبے ایسے ہیں جن کے تحت سوسائٹی میں نہ صرف توازن قائم ہوتا ہے بلکہ کمزوروں اور بے کسوں کو ظالموں کی ریشہ دوانیوں سے پناہ ملتی ہے اور وہ امن اور سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ظالم اقتدار خواہ اُس کے اندر کتنی ہی تندی اور تیزی موجود ہو، جلد ہی فنا اور برباد ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ وہ ظالموں کو سُدھرنے اور اپنے مظالم سے باز آنے کے مواقع تو فراہم کرتا ہے لیکن وہ انہیں دیر تک لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہیں رہنے دیتا۔ اُن کی زندگی بیتِ عنکبوت سے بھی زیادہ ناپائدار اور پانی کے بلبلے سے زیادہ غیر یقینی ہوتی ہے۔

"تاریخ پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں کتنی ظالم اور سفاک قومیں دنیا کے سینے پر اُبھریں۔ انہوں نے کس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قوت اور طاقت کو غلام بنایا اور پھر اُس طاقت کو اخلاقِ انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت پر صرف کرنے کی بجائے اُسے غریبوں اور ناداروں کو ستانے، بے لبسوں کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنانے کے لیے بے دریغ استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاقت جو اُن کی ترقی کا راز تھی وہی اُن کی موت اور بربادی کا ذریعہ بنی اور تاریخ کے وہی اوراق جن میں انصاف پسند قوموں کے کارنامے سنہری حروف سے لکھے جاتے ہیں وہاں ان سفاکوں، اور زیردست آزاروں کی ظالمانہ کارروائیوں اور ان کے انجامِ بد کو داستانِ عبرت کے طور پر درج کیا گیا۔

ہندوستان کی ترقی کا راگ خواہ کتنے ہی اونچے سُروں میں الاپا جائے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس کے برسرِ اقتدار طبقے نے مُسلم اقلیت کے ساتھ جو غیر منصفانہ بلکہ بے رحمانہ رویّہ اختیار کر رکھا ہے اُسے دیکھ کر اُس کے مستقبل کے بارے میں کوئی اچھی اُمید قائم نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ میں اس سے پہلے بھی جن قوموں نے غریبوں پر دستِ ظلم دراز کیا وہ کسی اچھے انجام سے دوچار نہ ہو سکیں اور اس ظلم و استبداد نے اُن کی اپنی جڑوں کو ہی کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی طرف غیر ملکی مبصرین نے ہی اشارہ نہیں کیا بلکہ ہندوستان کے سنجیدہ اور ذی شعور طبقہ کو بھی اس خطرناک صورتِ حال کا پوری طرح احساس ہے۔ اور اس نے مختلف موقعوں پر اس کا کھلے بندوں اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ بھارت کے سربراہ پنڈت جواہر لال نہرو نے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"جب تک فرقہ واریت کی ذلّت کو ختم نہ کیا جائے ملک کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ پڑتی رہے گی۔ مدھیہ پردیش میں جو کچھ ہوا وہ صدفی صد ناانصافی اور وحشتناک ہے۔ جس نے ہم کو ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر عظیم صدمہ پہنچایا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ اچانک نہیں ہو سکتا تھا اُس کا خاصا حصہ منظم تھا۔

(پارلیمنٹ میں تقریر)

اسی طرح جناب ارجن سنگھ بھدوریہ نے جو بھارت کی مرکزی اسمبلی کے ایک ممتاز رکن ہیں انہوں نے بڑے رنج کے ساتھ فرمایا:

"علی گڑھ میں جو شرمناک واقعات ہوئے وہ ہندوستان کی پیشانی پر ایک بہت بڑے سیاہ دھبّہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابھی تک فرقہ وارانہ جنون کے جو مظاہرے ہوئے ان میں کبھی بھی عورتوں اور معصوم بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا گیا تھا۔ لیکن علیگڑھ میں اسپتال میں جا کر درجنوں مجروح عورتوں کو دیکھا۔"

"کوئی ایک درجن عورتیں اسپتال میں بہت بُری حالت میں تھیں۔ جب میں

بے ہوش مس نفیس کو دیکھ رہا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ اُس کی ماں اور دو بھائی بلوے میں مارے گئے
میں برداشت نہ کر سکا اور نمناک آنکھوں کے ساتھ اسپتال سے باہر نکل گیا۔ یہ ساری عورتیں
محلہ مانک چوک کی رہنے والی ہیں۔ انوری بیگم نے تو اپنے محلہ کے ان لوگوں کے نام تک
بتائے جنہوں نے ان کے گھر کو لوٹا۔ زیورات لے گئے اور گھر میں آگ لگائی۔ میں نے مانک
چوک میں بشیر احمد پوسٹ مین کا جلا ہوا گھر دیکھا اور وہ جگہ بھی دیکھی جہاں اس پوسٹ مین کو
جلایا گیا تھا . . . . . محلہ مانک چوک میں مغلوں کی مسجد کو بھی جسے جلا کر خاک کر
دیا گیا تھا سینکڑوں مسلمان بھائیوں نے مجھے دکھایا۔ یہاں لوگوں نے مجھے قرآن مجید کے جلے
ہوئے اوراق بھی دکھائے۔ میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ انسان اس درجہ
پاگل ہو سکتا ہے کہ وہ خدا اور بھگوان کے گھر میں بھی پاگل پن کا ثبوت دے۔ وہاں پر
جو سامان تھا وہ بھی سب لوٹ لیا گیا۔ خدا کے گھر میں پاگل لٹیروں نے یہ ننگا ناچ ناچ کر
ہندوستان کا سر جھکا دیا"

پھر ہندوستان کے بہت سے سنجیدہ لوگوں نے اس اخلاقی انحطاط، تعصب، تنگ نظری اور بہیمیت کے اسباب کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ اس غیر انسانی طرزِ عمل کی سب سے بڑی وجہ وہ احساسِ شکست ہے جو ہندو قوم تقسیمِ ملک کے وقت ہی سے بری طرح محسوس کر رہی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اُسے پورے ہندوستان کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہونا چاہیے تھا۔ مسلم اکثریت کے جو علاقے مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں وہ سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے اور تقسیمِ ملک پر اسے مجبور کر دینا اُس کی شکست ہے۔ ہندو قوم کے اس غلط احساس کے لیے کوئی معقول بنیاد نہ تھی لیکن اُس نے اپنے سینے میں بڑے ہی متعصبانہ جذبات کی پرورش کر کے اس احساس کو اپنی قومی زندگی کا ایک جزو بنا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اعمال کے سارے اخلاقی نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر کمزوروں پر ٹوٹ پڑی۔ ملک کے اندر ایک طرف اُس نے اس انتقام کی آگ کو بے بس مسلمانوں

کا خون بہا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف مختلف ریاستوں پر تشدد کے ساتھ قبضہ کرنا شروع کیا۔ منگرول، مناودر، جوناگڑھ، حیدر آباد اور گوا آج زبانِ حال سے بھارت کے ظلم و استبداد کی داستان بیان کر رہی ہیں۔

کشمیر پر بھارت کا قبضہ اتنا وحشیانہ اور سنگدلانہ فعل ہے کہ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہاں کے برسرِ اقتدار طبقہ کا ضمیر بالکل مُردہ ہو چکا ہے اور اُس میں کوئی اخلاقی حس باقی نہیں رہی۔ حیدر آباد اور جوناگڑھ کو اس بنیاد پر ہڑپ کیا گیا کہ وہاں کے باشندگان کی اکثریت غیر مسلم ہے اور ہندوستان کے ساتھ الحاق چاہتی ہے اور ریاستیں اُسی ملک کے ساتھ شامل ہونی چاہییں جس کے لیے اُن کی اکثریت خواہشمند ہو۔ لیکن اس اصول کو کشمیر میں یکسر نظر انداز کر کے یہاں یہ کہہ کر اس پر قبضہ جمایا گیا۔ یہاں کا حکمران اس ریاست کو ہندوستان کی تحویل میں دینے کا آرزومند ہے۔

اس ضمن میں بھارت نے اہلِ کشمیر، پاکستان اور اقوامِ متحدہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیے تھے اُن کی جس انداز سے مٹی پلید کی گئی ہے وہ تاریخِ انسانی کی ایک نہایت ہی عبرتناک داستان ہے۔ انہیں دیکھ کر انسان کے لیے یہ باور کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ دنیا میں اصل چیز قوت و طاقت ہے اور بین الاقوامی معاملات تو اسی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ ایک قوم طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر اٹھتی ہے اور وہ پوری دنیا کے دیکھتے دیکھتے ایک بے سرو سامان قوم پر اپنا پنجۂ استبداد گاڑ دیتی ہے۔ ایک طرف راستی و صداقت ہے اور دوسری طرف کذب و دروغ بافی۔ ایک جانب مظلومانہ مدافعت ہے اور دوسری طرف جارحانہ پیش قدمی۔ ایک طرف بے چارگی اور بے سرو سامانی ہے اور دوسری طرف جدید اسلحہ کی فتنہ سامانیاں، اس پر بھی اہلِ کشمیر جس جانبازی اور شجاعت کے ساتھ لڑے وہ کوئی بھول جانے والی بات نہیں۔ اُن بیچاروں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تو خیر ہوا ہی، لیکن اسے دیکھ کر دورِ حاضر کے اخلاقی انحطاط کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو گئی ہے کہ اقوامِ متحدہ ممکن ہے طاقتور قوموں کے لیے کوئی اہمیت رکھتی ہو لیکن کمزوروں

کے لیے یہ بالکل ایک بیکار ادارہ ہے۔ تہذیب کے علمبرداروں نے اور تمدن کے دعویداروں نے یہ خونیں تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اقوامِ متحدہ جسے امن و صلح کا نقیب اور مظلوموں کی آخری پناہ گاہ ہونے کا دعویٰ ہے اُس نے بھی مظلوم کشمیریوں کی کوئی دادرسی نہ کی۔ نااہلکات کے ڈھکوسلے کے پیچھے بیٹھ کر مہذب اقوام نے اطمینان کے ساتھ اس ظلم و ستم کو دیکھا اور خاموش رہیں۔ کسی نے اپنا دستِ تعاون آگے نہ بڑھایا کسی نے آگے بڑھ کر ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کی مظلوموں کی دلخراش صدائیں اور بے کسوں کی پُردرد آہیں بھی انسانیت کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے میں ناکام رہیں یہاں تک کہ صداقت و راستی نے کذب و باطل کے آگے سر جھکا دیا اور ایک کمزور اور بے نوا قوم اپنی حریت و آزادی کو حرص و ہوسناکی کی دیوی کے آگے قربان کرنے پر مجبور ہو گئی۔

ہندوستان نے اس سلسلہ میں جس انسانیت سوز روش کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کے متعلق مہذب دنیا نے محض اُس کی قوت و طاقت سے مرعوب ہو کر جس افسوسناک بے حسی کا ثبوت دیا ہے اُن کے نتائج کے بارے میں غور و فکر کرنا اُن کا اپنا کام ہے۔ ہم اس معاملے میں صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ جس جبر و استبداد کو یہ لوگ بھارت کی عظیم الشان فتح قرار دے رہے ہیں وہ اس قوم کے لیے ایک ایسا نقطہ انحراف بھی ثابت ہو سکتا ہے جہاں سے وہ تنزل اور بربادی کی طرف دھکیل دی جائے کمزوروں اور بے کسوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ کر، اپنے کیے ہوئے وعدوں کو قوت و طاقت کے زعم میں پس پشت ڈال کر، مدمقابل کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو یکسر نظر انداز کر کے آج تک دنیا کی کسی قوم نے ترقی نہیں کی۔ یہ ایک ایسی روش ہے جو وقتی طور پر دوسروں کو ہراساں کر سکتی ہے لیکن اس کے نتائج ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔

ہندوستان اس معاملہ میں جو موقف چاہے اختیار کرے اور مغربی اقوام جس طرح چاہیں اُس کے ساتھ سلوک کریں۔ یہ اُن کا باہمی معاملہ ہے جس کے اثرات سے اگرچہ ہم محفوظ نہیں رہ سکتے لیکن ہم اس صورتِ حال کو بدلنے کی بھی اِس وقت اپنے اندر کوئی قوت اور طاقت نہیں رکھتے . . . .

اس پر اصل غور و فکر انہی لوگوں کو کرنا چاہیے جو اس کے ذمہ دار ہیں اور انہیں اپنی قوم کی دشمنی نہیں بلکہ خیر خواہی مقصود ہے۔

یہ افسوسناک صورتِ حال جو کچھ بھی ہے وہ اپنی جگہ موجود ہے اور اس کے نتائج بھی پوری طرح مکمل کر ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ اب ہمارے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہم اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے کونسا قدم اٹھاتے ہیں۔ کیا ہم سب واویلا کر کے خاموش ہو جانا چاہتے ہیں یا ہم اپنے سامنے کچھ ایسی تدابیر رکھتے ہیں جنہیں اختیار کر کے ہم دوسروں کی تاخت سے محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں

پندرہ سال کے گزشتہ واقعات نے اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ مغربی اقوام خواہ اُس کا تعلق اشتراکی بلاک سے ہو یا غیر اشتراکی بلاک سے پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کی طرف زیادہ مائل ہیں اور وہ ہر قیمت پر اس کی تائید اور حمایت حاصل کرنے کی متمنی ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ بھارت چونکہ پاکستان کی نسبت زیادہ طاقتور ہے اس لیے بین الاقوامی رسہ کشی میں جس بلاک کا اس ملک نے ساتھ دینے کی آمادگی ظاہر کی وہی بلاک زیادہ مضبوط ہوگا۔ اس لیے ہمیں اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بلاک بھی بھارت کی کسی قیمت پر ناراضگی مول لینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا الا یہ کہ خود اُس ملک کو ہی اس کے بڑھتے ہوئے استعماری عزائم سے خطرہ لاحق ہونے لگے۔ جس کی اس وقت اس سے بہت کم توقع کی جا سکتی ہے۔

دوسرے ہر بلاک یہ سمجھتا ہے کہ ایشیا کے اندر یہی وہ واحد ملک ہے جو اُن کے مفادات کی پوری طرح حفاظت اور پاسبانی کر سکتا ہے۔ اگر یہ اشتراکیت کا ساتھ دے تو پھر اینگلو امریکن بلاک کے بڑھتے ہوئے تسلط کو اسی کی وساطت سے روکا جا سکتا ہے اور اس کے برعکس اگر یہ سرمایہ دار ملکوں کی تائید پر رضامند ہو جائے تو پھر اس کی مدد سے اشتراکیت کے آگے بند باندھنا ممکن ہوگا۔ اپنی اس مضبوط پوزیشن کی وجہ سے بھارت ان دونوں بلاکوں سے جو مطالبہ بھی کرے گا وہ فی الفور پورا کر دیا جائے گا

بلکہ اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے ہر بلاک اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ دیکھیے کہ چین اور بھارت کے سرحدی تنازعوں میں امریکہ اور انگلستان نے پاکستان کے جذبات کو کس بری طرح نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کی کس خوش دلی کے ساتھ پوری پوری معاونت اور دستگیری کی ہے اور اس سرعت کے ساتھ اُسے اسلحہ فراہم کیا ہے جیسے کہ اُن کی اپنی سرحدیں خطرات میں گھر گئی ہوں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ مغربی قومیں بھارت کے مقابلے میں ہمارے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کریں گی انتہائی سادگی ہے، ایک ایسی سادگی جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے ملے ہوئے ہیں۔

تیسرے مغربی قوموں کی رفاقت اور دوستی پر اس وجہ سے بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے ہاں بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد امانت اور دیانت پر نہیں بلکہ مصلحتِ وقت پر رکھی گئی ہے۔ اُن کے ہاں دوستی اور دشمنی کا صرف ایک معیار ہے اور وہ ہے مصلحت پرستی۔ اس لیے اُن کے سارے عہد و پیمان، اُن کی یقین دہانیاں محض دھوکہ ہیں۔ وہ جب بھی کسی وعدے کو اپنی مصلحت کے خلاف پاتی ہیں تو اسے توڑنے میں انہیں قطعاً کوئی باک نہیں ہوتا۔ اپنے عہد کا پاس اور اُس کی پابندی وہ صرف اُس حد تک ہی کرتی ہیں جس حد تک اُن کے اپنے مفادات پر کوئی ضرب نہ پڑنے پائے لیکن جس لمحہ میں یہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کے مفادات پر معمولی سے معمولی زد پڑ رہی ہے تو پھر وہ انہیں بلا تکلف اٹھا کر پھینک دیتی ہیں۔ امریکہ نے ہندوستان کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر کے جس بددیانتی کا ثبوت دیا ہے اُسے دیکھ کر ہمیں ان قوموں سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں ہو سکتی۔ امریکہ کس شرمناک طریق سے ہمارے جذبات اور احساسات سے مسلسل کھیلتا رہا ہے اور اندر ہی اندر وہ ہمارے دشمن کے ساتھ محبت کے رشتے استوار کرنے میں برابر مصروف رہا ہے۔ مغربی ڈپلومیسی کی یہ ایک ایسی بدترین مثال ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس بنا پر مغربی اقوام سے کسی خلوص، سچائی اور انصاف کی توقع رکھنا محض ابلہ فریبی ہے۔ ہمیں اس بات کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے کسی قول و قرار کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں۔ ان کی حیثیت مرغ بادنما کی سی ہے جسے وقتی مصلحتوں کے تھپیڑے جس طرف چاہیں گھما دیں۔

پھر مغرب اگرچہ کافی حد تک "روشن خیال" ہو گیا ہے لیکن اُس کے دل سے ابھی تک وہ کینہ اور بغض نہیں گیا جو صلیبی جنگوں کی یاد سے اُس کے اندر برابر سلگ رہا ہے۔ چنانچہ گذشتہ دو صدیوں میں اُس نے اسلامی ممالک کو جس طرح سے تاخت و تاراج کرنے کی مختلف کوششیں کی ہیں وہ ایک انتہائی دلفگار داستان ہے۔ مغربی طاقتوں نے ہر اُس ملک کو پامال کیا جس میں اسلام کے اُبھرنے کے کچھ بھی امکانات موجود تھے۔ انہوں نے ہر اُس تحریک کو کچلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جو احیائے اسلام کا عزم رکھتی تھی اور اس کے مقابلے میں اُنہوں نے ہر اُس گروہ کی دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کی جس نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب و تمدن میں رنگنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس معاملہ میں مغربی قوموں نے انتہائی چوکسی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اس ڈرامہ میں براہِ راست ایکٹر کا پارٹ ادا نہیں کرتیں بلکہ مسلمانوں کے اندر سے ایسے لوگوں کو کمک پہنچانے کی سعی کرتی ہیں جو اپنی قوم کے جذبات و احساسات کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اُن کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ مُسلم ممالک کے اندر ایک قسم کی خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ امتِ مُسلمہ کے اندر بعض ایسے طبقوں نے سر اٹھا لیا ہے جو اس امت کے اندر ہر قسم کا فتنہ و فساد برپا کر رہے ہیں اور غیروں کے فراہم کردہ وسائل سے اس ملت کو مغربی اقدار کا غلام بنانے کے درپے ہیں۔

ان حالات میں ہمارے لیے راہِ نجات کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اس وقت ہر پاکستانی کو پریشان کر رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری پہلی گزارش یہ ہے کہ ہم نے مغربی قوموں پر بے جا اعتماد کر کے اُس کے خطرناک نتائج کو اپنی آنکھوں سے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اس لیے ہمیں غیروں پر بھروسہ کرنے کی پالیسی کو یکسر ترک کر دینا چاہیے اور اس بات کا عزم بالجزم کرنا چاہیے کہ اب ہم سب جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک ایسی بلند و بالا ذات پر بھروسہ کریں گے جو اس دنیا میں قوت و طاقت کا حقیقی سرچشمہ

ہے اور جس کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کر لینے کے بعد پھر ہم پر کبھی بھی ذلت اور مسکنت مسلط نہیں ہو سکتی۔ خدا پر ایمان محض چند حروف کا ایک کلمہ ہی نہیں بلکہ دنیوی سربلندی اور اُخروی فلاح کی ضمانت ہے۔ دنیا کی جس قوم نے اس ایمان کو اپنے سینے میں اُس کے پورے مقتضیات کے ساتھ پالا ہے اُسے کبھی کوئی جابر سے جابر قوم بھی سرنگوں نہیں کر سکی ۔

اللہ کو پا مردئ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

کوئی شاعرانہ بڑ نہیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے

دنیا کی جس قوم نے بھی اپنے اندر کسی مقصد کے ساتھ عشق پیدا کر کے اپنی زندگی کو اُس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور پھر اُسے سربلند کرنے کے لیے جان و مال کی قربانی دینے پر آمادہ ہوئی، قوت و طاقت نے خود آگے بڑھ کر اپنی عنانِ اختیار اُس کے سپرد کر دی اور اُس نے اُسے جس طرح چاہا بے دریغ استعمال کیا۔ آج اگر قوم پرستی کا خوفناک جذبہ یورپ کی مختلف اقوام کو سرگرمِ عمل کر سکتا ہے، اگر نسلی تفوق اور برتری کا شیطانی فلسفہ اہلِ جرمن کے لیے زندگی کی حرارت پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے، اگر اشتراکیت جیسا انسانیت سوز نظریہ روس اور چین جیسی بیکار اور پسماندہ قوموں کو نئے نئے عزائم اور ولولے عطا کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام جیسا الہامی دین اور متوازن اور حیات آفریں نظامِ حیات مسلمانوں کے دلوں کو گرمانے اور اُن کے اندر خونِ زندگی دوڑانے میں ناکام رہے ۔

ماضی کا تو ذکر چھوڑیئے، گذشتہ چند سالوں میں ہم اس اسلامی نصب العین کی اثر آفرینی کے مختلف مظاہر دیکھ چکے ہیں۔ خود پاکستان کا وجود اس کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اسلامی نظامِ حیات کے ایک نعرے ہی نے اپنی مقناطیسیت سے جوڑ کر ہمیں ایک وحدت بنا دیا۔ ہمیں ایسی قوت و

طاقت بخشی جس کی مدد سے ہم نے مختلف مخالفتوں اور مزاحمتوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ ہمارے اندر ایثار اور قربانی کے لیے نہایت ہی پاکیزہ جذبات ابھرے اور ہم اس بلند و بالا مقصد کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ جس نصب العین کی کشش اور محبت اور جس نظامِ حیات کی طلب اور لگن ہمارے اندر یہ جوشِ عمل پیدا کرسکتی ہے کہ ہم اس کرۂ ارضی پر ایک نئے مسلمان ملک کا اضافہ کر دیں، اُس نصب العین اور اُس نظامِ حیات میں بہر حال یہ طاقت بھی موجود ہے کہ وہ ہمیں اس ملک کے حفظ و بقا کے لیے بھی پوری طرح صف بستہ کرسکے۔

مسلمانوں کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی تو اس کے لیے یہ امر بجائے خود کافی پریشان کن ہوتا کہ وہ ایک ایسا اجتماعی تخیل، ایسا مقصد، ایسی قدریں، ایسے اصول کہاں سے لائے جو اُس قوم کے مختلف عناصر کے انتزاعی تخیلات پر غالب ہو کر اُسے ایک بنیانِ مرصوص بنا سکیں۔ لیکن ہمارے ہاں تو خوش قسمتی سے یہ سب کچھ موجود ہے اور صدیوں کی روایات پہلے ہی اس کی جڑیں ہماری زندگی میں پوری طرح پھیلا چکی اور گہری اتار چکی ہیں۔ صرف ہماری غفلت اور دورنگی نے اسے مضمحل کر رکھا ہے اور اس وجہ سے ہم قوت و استحکام کے اس لازوال اور عظیم خزانے سے محروم ہو رہے ہیں۔ جس نے نہ صرف ہمیں ایک الگ ملی وجود بخشا بلکہ جس کی بدولت کئی صدیوں تک پوری دنیا کی امامت اور سربراہی بھی ہمارے ہاتھ میں رہی۔ یہ محض اس نصب العین کی برکت تھی کہ ہم صحرا کے ایک گوشے سے اٹھ کر ساری دنیا پر چھا گئے۔ ہماری تہذیب دنیا کی غالب تہذیب سمجھی گئی۔ ہمارے خوب و ناخوب کے پیمانوں کے مطابق قوموں نے اپنی اقدارِ حیات متعین کیں۔ ہمارے پیش کردہ قوانین اور اخلاقی ضابطوں کی روشنی میں لوگوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کی۔ ہمارے اساسی تصورات سے متاثر ہو کر انسانوں نے انسانیت کا سبق سیکھا اور اپنے غصب شدہ بنیادی حقوق کی واپسی کے لیے جد و جہد شروع کی۔ ہم نے علم کی شمعیں جلائیں، تمدن کے گیسو سنوارے، اور انسانی عقل و فکر کو اُس کے صحیح مرتبہ اور مقام سے آشنا کیا۔ یہ کوئی عہدِ عتیق کا افسانہ نہیں بلکہ عہدِ حاضر کی ایک

ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس پر تاریخ کا ہر ورق شاہد ہے۔ آج اگرچہ ہم پر ادبار کی گھٹائیں چھا چکی ہیں، ہم دنیا میں ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کرۂ ارضی پر ہمارا کوئی وزن نہیں رہا۔ آج بھیڑوں کے گلّے کی بھی ایک قیمت ہے لیکن انسانوں کی اس بھیڑ کی جسے امتِ مسلمہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے آج واقعی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن ہم ابھی تک یہ بات نہیں بھولے

کبھی ہم بھی با اقبال تھے نہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جب تک ہماری پیشانی اپنے خالق اور مالک کے سامنے پورے اخلاص کے ساتھ جھکتی رہی تو پوری نوعِ انسانی ہماری دست نگر رہی اور زمانہ بھی اپنی رفتار متعین کرنے کے لیے ہمارے اشاروں کا منتظر رہا۔

اُس بلندی اور اقبال مندی اور موجودہ ذلت و پستی کے اسباب پر ہم جب غور کرتے ہیں تو ہمیں ہر پھر کر صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے کہ ہم نے اُس چشمۂ حیواں سے بحیثیتِ ملت مُنہ موڑ لیا ہے جو ہماری طاقت کا اصل مبداء ہے اور اپنے آپ کو اُس بحرِ ظلمات میں کھو دیا ہے جس سے انسانیت کو نکالنے کے لیے ہم اس دنیا میں پیدا کیے گئے ہیں۔ ہم اپنے اصل سبق کو بھول گئے ہیں۔ ہم نے اُس انقلاب انگیز پیغام کو بھی فراموش کر دیا ہے جسے سننے کے لیے قومیں ہماری طرف متوجہ ہُوا کرتی تھیں اور ہم آج اُن ساری خوبیوں کو اپنے ہاں ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت مِٹا رہے ہیں جن کی بدولت دنیا ہمیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

ایک فرد کے نزدیک جو اہمیت روح کی ہے، قوموں کے نزدیک وہی اہمیت اجتماعی تخیلات اور اُن کے مقاصد کی ہوتی ہے۔ جس طرح روح کے جسم سے الگ ہو جانے کے بعد بے جان جسد زندہ انسانوں کے لیے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتا۔ بلکہ اُن کے لیے ہر لحاظ سے مضرت رساں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ جلد از جلد اسے ٹھکانے لگانے کے لیے فکر مند ہوتے ہیں بالکل

اسی طرح قومیں اپنے نصب العین سے بے تعلق ہوکر، اپنے اساسی تصورات سے رشتہ توڑ کر، اور اپنے مقاصد اور نصب العین سے الگ ہوکر لاشیں بن جاتی ہیں جن سے پھر قافلۂ انسانیت انسانوں کی حیثیت سے معاملہ نہیں کرتا بلکہ انہیں خاک کا ڈھیر سمجھتے ہوئے یکسر نظرانداز کرکے آگے بڑھتا ہے اور اگر وہ راہ میں حائل ہوں تو پھر انہیں ٹھوکروں کے ذریعہ بڑی بے رحمی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

ہمارے پاس آخر وہ کونسی ایسی چیز ہے جس کی بدولت دنیا ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھے۔ تعداد کے اعتبار سے ہم کوئی قابلِ قدر حیثیت نہیں رکھتے۔ خصوصاً جب یہ تعداد بھی زندگی کی حرارت بھی کھو چکی ہو اور اس کے اندر جینے اور ترقی کرنے کے سارے ولولے ختم ہو چکے ہوں۔ یہ بے جان لاشے جتنے زیادہ ہوں گے اتنے ہی یہ کرۂ ارضی پر بوجھ تصور کیے جائیں گے۔ پھر زرومال کی ہمارے ہاں کوئی ایسی فراوانی نہیں جو دوسری قوموں کے لیے کشش کا باعث ہو۔ علم و ہنر میں ہم نے کوئی ایسی حیرت انگیز ترقی نہیں کی جس کی وجہ سے دوسری قومیں ہماری رہنمائی اور تعاون کی ضرورت محسوس کریں۔ پھر یہ افکار و نظریات جنہیں ہمارے ہاں فروغ دینے کے لیے ہمارا برسرِاقتدار طبقہ بیتاب ہے، یہ سب دانشِ فرنگ کی کرشمہ سازیاں ہیں جنہیں اپنا کر ہم نقال اور تابع مہمل تو کہلا سکتے ہیں لیکن کبھی بھی قیادت اور سربراہی کا منصب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر دنیا میں باعزت طور پر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ غیروں کی کاسہ لیسی کرنے کی بجائے اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا میں اٹھیں اور اپنے اس خطۂ پاک کو مغرب کے باطل افکار و نظریات کی آماجگاہ بنانے کی بجائے تحریکِ اسلامی کا مرکز و محور بنائیں جہاں سے انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے نورِ ہدایت حاصل کر سکیں۔ اس ایک حیثیت کے علاوہ ہماری کوئی دوسری حیثیت اب ہمیں اس دنیا میں باوقار طریق سے زندہ نہیں رکھ سکتی۔ پھر ہماری یہ حیثیت ایک ایسی حیثیت ہے جس سے ایک طرف ہمارا خالق و

مالک ہم سے راضی ہوگا اور اس بنا پر ہم دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہونگے اور دوسری طرف اس کرۂ ارضی پر ہم ایک قہر اور ظلمت کی طاقت کی حیثیت سے ابھرنے کی بجائے ابرِ رحمت بن کر برسیں گے جس کی بدولت یہاں نیکی اور شرافت کے پھول کھلیں گے۔ خدا خوفی اور فکرِ آخرت کے مرجھائے ہوئے نخل ہرے بھرے ہونگے، عدل و انصاف کی کھیتیاں سیراب ہونگی اور اس طرح گلشنِ انسانیت میں جو مادیت کی بادِ سموم سے قریب قریب اُجڑ چکا ہے، پھر سے فصلِ بہار آئے گی۔

لیکن یہ خوشگوار تبدیلی محض آرزوؤں اور تمناؤں کے بل بوتے پر ظہور پذیر نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے فکر و عمل کے میدان میں ایک عظیم انقلاب کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے اس سلسلہ میں فی الفور کرنے کے جو کام ہیں اُن میں سب سے ضروری یہ ہے کہ ہم گذشتہ پندرہ سالوں سے بحیثیت قوم اسلام کے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں، اس شرمناک کھیل کو ختم کردیں کیونکہ اسلام کوئی کھیل تماشہ نہیں بلکہ خدا کا نازل کردہ وہ واحد دین ہے جو پوری انسانیت کی فلاح و کامرانی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام کے ساتھ کبھی کبھار کے زبانی اشتغال پر قناعت کرکے یہ سمجھ لینا کہ اس سے پاکستان تحریکِ اسلامی کا منبع بن سکتا ہے پرلے درجے کی حماقت ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے اسلام کے بارے میں اُس تناقض کو دُور کرنا چاہیے جو ہماری زندگی کے سارے شعبوں میں نمایاں ہے اور جس میں بدقسمتی سے ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر پاکستان کو تحریکِ اسلامی کا مرکز بنانا ہے تو پھر یہاں کی سیاست، معیشت، معاشرت اور تعلیم سب کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ یہاں پھر پوری کوشش کے ساتھ اس امر کا التزام کرنا چاہیے کہ اس خطۂ پاک میں وہ بھلائیاں پروان چڑھیں جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کا قلع قمع ہو جنہیں اسلام مٹانے کا حکم دیتا ہے۔ اگر شراب خوری، قمار بازی، فحاشی اور بے حیائی یہاں اسی رفتار سے پھیلتی چلی جائیں اور حکومت ان کی اسی انداز سے سرپرستی کرتی رہے جس طرح کہ وہ اس وقت کر رہی ہے، اگر یہاں بندۂ مزدور کے اوقات اسی طرح تلخ رہیں جس طرح

کہ وہ فی الواقع اس وقت ہیں، غریبوں پر عرصۂ حیات روز بروز تنگ ہوتا چلا جائے اور ملک کی دولت سمٹ کر صرف ایک مختصر سے طبقے میں محدود ہو کر رہ جائے جو اسے صرف اپنی عیاشیوں میں صرف کرتا رہے، عوام اپنے بنیادی حقوق تک سے محروم ہوں، لوگوں کے جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ ہو، عدل و انصاف اتنا گراں ہو کہ اسے صرف اصحابِ ثروت ہی خرید سکیں — الغرض وہ ساری برائیاں یہاں ترقی پذیر ہوں جنہیں اسلام بیخ و بُن سے اکھاڑنا چاہتا ہے اور وہ ساری خوبیاں ناپید ہوں جنہیں اسلام پرورش کرنے اور پھیلانے کی تلقین کرتا ہے، تو اس افسوسناک صورتِ حال کو دیکھ کر کونسا بیوقوف یہ باور کرے گا کہ اس ملک سے اسلام کا نور پھوٹنے والا ہے۔

اسلام اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے، اُس میں بڑھنے اور پھیلنے کی زبردست قوت موجود ہے، اُس کی تعلیمات میں یہ سحر ہے کہ وہ اپنے بدترین دشمنوں کو اپنا دلسوز رفیق اور جاں نثار بنا لے۔ اس کے راستے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمانوں کی دورنگی اور منافقت ہے، اگر اسلام کی عالمگیر سچائیاں صرف قرطاس میں محفوظ ہوتیں اور اُن کے ساتھ اُن نفوسِ قدسی کے افعال و اعمال کا تاریخی ریکارڈ بھی موجود ہوتا جو اس دین کے صحیح معنوں میں پیرو تھے تو انسانیت اسے قبول کرنے میں اتنی متأمل نہ ہوتی جتنی کہ وہ مسلمانوں کا طرزِ عمل دیکھ کر ہوتی ہے۔ وہ جب یہ دیکھتی ہے کہ خود اس دین کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے اپنی عملی زندگی میں اس سے کنارہ کش ہو چکے ہیں اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے جو خاکے اور نقشے تیار کر رہے ہیں وہ مغربی تہذیب کا چربہ ہیں تو ان حالات میں وہ یہ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے کہ اسلام شاید اپنی عملی افادیت اب کھو چکا ہے اسی وجہ سے اس کے ماننے والے اب دوسروں کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔

ہم میں سے وہ لوگ جنہیں کبھی بھی کسی یورپین سے اسلام کے بارے میں کھل کر گفتگو کرنے کا

موقع ملا وہ اس صورتِ حال کی ضرور تائید کریں گے۔ خود راقم الحروف کو کئی مرتبہ اس کا ذاتی تجربہ ہُوا۔ ایک جرمن نژاد پروفیسر جنہیں اسلام سے خاصا لگاؤ تھا اور جو اسلامی روایات کے بڑے قدرداں تھے۔ وہ ایک مرتبہ ملنے کے لیے تشریف لائے اور اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے "اسلام نے اپنے عہد میں واقعی ایک بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے"۔ جب میں نے یہ کہا کہ یہ آج بھی انسانی دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے اور انسانیت آج جن مصائب میں گرفتار ہے اُن سے اسے احسن طریق سے نجات دلا سکتا ہے تو کہنے لگے "آپ کو ایک مسلمان کی حیثیت سے ایسا ہی عقیدہ رکھنا چاہیے" مَیں نے کہا: یہ چیز عملی اعتبار سے بھی حقیقت ہے" تو کہنے لگے "مجھے اس کے قبول کرنے میں کافی تردّد ہے، اگر یہ واقعی انسانی دکھوں کا مداوا ہے تو پھر سب سے پہلے آپ کو اپنے اس نسخۂ کیمیا کو آزمانا چاہیے۔ آپ جو مغرب کی نقالی کر رہے ہیں تو یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ دین کم از کم اجتماعی زندگی میں اب اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ دنیا کا کونسا ایسا انسان ہے جسے اپنی عزت بھی عزیز ہو اور وہ اپنے قبضہ میں ایک بیش بہا خزانہ رکھتے ہوئے دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے"۔ اُسے تو خیر مَیں نے جواب کے طور پر چند فقرے کہہ دیئے لیکن مجھے اس کی گفتگو سے اس بات کا ہلکا سا اندازہ ہو گیا کہ ہم کس طرح اسلام کی راہ میں اب ایک سنگِ گراں بن گئے ہیں۔

پاکستان کے مسلمان اگر واقعی ایک آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں تو پھر غیروں کی بدعہدیوں اور کم ظرفیوں اور خرمستیوں پر غضبناک ہونے کی بجائے ضروری ہے کہ ہم پہلے اپنے گھر کے اندر اصلاح احوال کی کوشش کریں اور ملک کو داخلی اعتبار سے ایک طاقتور ملک بنائیں۔ اس کے لیے سب سے اہم اور ضروری تبدیلی وہی ہے جس کا ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ ہم اسلام کے معاملے میں منافقانہ روش ترک کر کے پوری یکسوئی اختیار کریں۔

یہ ملک اسلام کے نام پر لیا گیا تھا، اسلامی نظام کے احیا کے لیے ہی مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ اس لیے اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کی بھی فکر کرنی چاہیے۔ اگر کچھ لوگ یہاں دوسرے تجربات کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ نہیں کہ وہ مختلف قسم کے ناجائز طریقوں کو استعمال میں لا کر مسندِ اقتدار حاصل کرلیں اور پھر قوت کے بل بوتے پر لوگوں پر اپنے دلپسند افکار ٹھونسنے کی مذموم کوشش کریں۔ اُن کے لیے جائز اور صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ ایچ پیچ کی ساری پالیسیوں کو ترک کردیں اور جو اُن کے نظریات ہیں انہیں کھل کر عوام کے سامنے پیش کریں تاکہ عوام اُن کا اچھی طرح جائزہ لے سکیں اور یہ اندازہ کرسکیں کہ وہ انہیں کس حد تک قابلِ قبول ہیں۔ اور اگر وہ رائے عامہ کی تائید سے اقتدار کی باگیں سنبھالنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر انہیں اس مخمصے سے نجات مل جائے گی جس میں وہ اس وقت اپنے آپ کو گرفتار پاتے ہیں اور وہ پوری یکسوئی اور اطمینانِ قلب کے ساتھ قوم کو مغرب کا پرستار بنا سکیں گے اور اس کے برعکس اگر وہ اپنے نظریات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں ناکام ثابت ہوں اور یہاں کے عوام اس ملک میں اسلام کی ہی بالادستی قائم کرنے پر مصر ہوں تو پھر اُن کی وطن دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ یا تو وہ اپنے فکر و نگاہ کے زاویوں میں اس انداز کی تبدیلی پیدا کریں کہ وہ قوم کے افکار و تصورات سے بالکل ہم آہنگ ہو جائیں یا پھر قوم کو اس بات کا کھلا موقع دیں کہ وہ اُن لوگوں کو پوری آزادی کے ساتھ اقتدار کے تخت پر متمکن کرسکے جو اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو بروئے کار لانے کا عزم اور اہلیت رکھتے ہوں۔ گذشتہ تیرہ سال کے عرصہ میں برسرِ اقتدار طبقہ نے اس قوم کی خواہشات کا جس بے دردی سے گلا گھونٹا ہے، اُس سے قوم کے اندر کوئی تعمیری صلاحیت اُبھر نہیں سکی۔ یہ طرزِ عمل ہمیشہ قوموں کو بزدل بناتا ہے اور ان کے اندر یاس و قنوطیت کے جراثیم کی پرورش کرتا ہے جو بالآخر اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں اس بنا پر داخلی استحکام کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ اس ملک کی عنانِ اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے جو قوم کی تمناؤں کی بطریقِ احسن تکمیل کرسکیں

ان کا طرزِ عمل قومی تصورات کی عکاسی کرے اور اُن کی منصوبہ بندیاں قومی امنگوں کا مظہر ہوں۔

داخلی استحکام کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کی بھی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ریاستیں جن کے باشندوں کے ساتھ ہمارا دینی رشتہ قائم ہے وہ ہم سے قریب تر ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت قریب قریب ساری عرب ریاستیں نیشنلزم کا شکار ہیں اور اس بنا پر انہوں نے ہمارے ساتھ اُس اخوت اور ہمدردی کا سلوک نہیں کیا جس کے کہ ہم بحیثیت مسلم فی الواقع مستحق تھے لیکن اس معاملے میں ہم سے بھی بعض بڑی بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں جن کا ازالہ کرنے کی ہمیں جلد از جلد فکر کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں پہلی چیز جس کا اہتمام نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس خطہ پاک کی نمائندگی کا فرض صرف انہی لوگوں کو سونپا جائے جو فکر و عمل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔ اب تک جن لوگوں کے سپرد یہ کام رہا ہے انہوں نے اپنے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے تعلقات کو بہتر بنانے کی بجائے انہیں کافی حد تک بگاڑا ہے۔ یہ لوگ مغربی تہذیب و تمدن کے اس حد تک دلدادہ اور فدائی ہیں کہ انہیں دیکھ کر کوئی شخص یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کسی اسلامی ریاست کے مسلمان نمائندے ہونگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا وہ تعلق جس کی بدولت ہم اُن ریاستوں کے باشندوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکتے ہیں وہ بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ ہمارے نمائندوں کی خلافِ اسلام حرکات کو دیکھ کر انہیں ہم سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

اسی سلسلہ میں دوسری زبردست ٹھوکر ہم نے یہ کھائی ہے کہ پاکستان کے قائم ہوتے ہی وزارتِ خارجہ کا قلمدان ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جو کسی لحاظ سے بھی اسلامی ریاست کا نمائندہ بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہ شخص ایک ایسی خانہ ساز نبوت کا قائل ہے جو برطانیہ کے استعماری عزائم کا ہمیشہ آلۂ کار رہی ہے۔ اس شخص نے ملک کی خارجہ پالیسی کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا پورا پورا التزام کیا کہ یہ خطۂ پاک عرب ریاستوں سے بالکل کٹ جائے اور اپنی قسمت کو منتقل

طور پر اینگلو امریکن بلاک کے ساتھ وابستہ کر دے۔

ہمارے سفارت خانے مرزائیت کے اڈے بن گئے۔ مرزائیوں کو کثیر تعداد میں بھرتی کر کے دوسرے ممالک میں بھیجا گیا جہاں انہوں نے ملک اور قوم کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی بجائے قادیانیت کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ یہ چیز عرب ممالک کے لیے ہر لحاظ سے ناقابلِ برداشت ہے ایک عرب جو عربی زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے پوری طرح واقف ہے وہ بے دین تو ہو سکتا ہے لیکن کبھی مرزا غلام احمد قادیانی جیسی بھونڈی اور غلط عربی لکھنے والے شخص کو نبی نہیں مان سکتا۔ اس کے علاوہ عرب مرزائیت سے صرف مذہبًا ہی متنفر نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ایک دیسی نبی کے اٹھنے سے ان کی رگِ عربیت کو بھی ضرب لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ عرب ریاستیں پاکستان کو ایک قادیانی یا نیم قادیانی مملکت سمجھ کر ہم سے روز بروز دور ہونے لگیں۔ اس افسوسناک صورتِ حال کا جتنی جلدی تدارک کیا جائے اتنا ہی یہ ہمارے حق میں بہتر اور مفید ہوگا۔

مسلم ریاستوں اور خصوصًا عرب ممالک کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لیے عربی زبان میں لٹریچر تیار کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہم سے زبردست کوتاہی ہوئی ہے امیر جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سلسلہ میں پچھلے دنوں ایک بصیرت افروز بیان دیا ہے ہم یہاں اُس کے اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے صورتِ حال کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں نے مشرقِ وسطیٰ میں محسوس کیا ہے کہ وہاں پاکستان کا پروپیگنڈا نہیں کیا جاتا۔ میں نے چار بار مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا ہے اور ہر سفر میں میرے تاثرات اور بھی زیادہ شدت اختیار کرتے گئے۔ عرب ملکوں میں اس لیے بھی پاکستان کا اثر و رسوخ نہیں کہ وہاں پاکستان کے سفارتخانے سرگرمِ عمل نہیں۔ اس کے برعکس بھارتی سفارت خانوں نے وہاں پروپیگنڈا پر اپنی تمام قوت صرف کر دی ہے۔ بھارت میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے

گئے۔ ان کی رُوداد عربی زبان میں شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہ عرب ممالک کے تعلیم یافتہ، بااثر افراد اور سربراہوں تک کو صحیح صورتِ حال کا علم نہیں۔

"اس کے برعکس بھارت عربی زبان میں وسیع پیمانے پر پروپگنڈا کر رہا ہے۔ ہر عرب ملک کے کسی بھی بک ڈپو میں ٹیگور، گاندھی، نہرو اور دوسرے ہندو لیڈروں اور ادیبوں کی کتابیں عربی زبان میں عام مل جاتی ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کے بارے میں ایک کتاب بھی نہیں ملتی۔ بھارت نے عرب مسلمان ادیبوں سے خوب کام لیا جبکہ پاکستان میں حکومت کرنے والوں کے نزدیک صرف ملّا ہی عربی داں ہے۔ یہاں عرب ادیبوں سے کام لینا تو درکنار پاک سفارت خانوں میں عربی بولنے والا عملہ نہیں ہوتا۔"

"ہمارے ملک کے نظامِ تعلیم میں عربی کو اب تک وہ حیثیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق ہے۔ ہمارے "صاحب لوگ" عربی کو محض ملّاؤں کی زبان قرار دیتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ خلیج فارس سے بحر اطلانتک تک سترہ عرب ملکوں کی یہ قومی زبان ہے اور ان میں سے اکثر اقوامِ متحدہ کے ممبر بھی ہیں۔ ان ریاستوں کو ہر طرح کے قابل آدمیوں کی ضرورت ہے جن میں ڈاکٹر، انجینئر، ماہرینِ زراعت اور مختلف علوم وفنون کے ماہر شامل ہیں۔ اگر ہمارے تعلیمی اداروں میں عربی زبان کو، دوسری یا تیسری زبان کے طور پر بھی رائج کر دیا جاتا اور عربی داں ماہرین تیار کیے جاتے تو ہم ان عرب ملکوں کو مطلوبہ ماہرین فراہم کر سکتے تھے لیکن یہ موقع بھی ہمارے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ حالانکہ اگر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی تو ان ملکوں میں ہمارے لیے بڑی خیرسگالی پیدا ہو سکتی تھی۔

اسی ضمن میں مولانا نے حج کے بارے میں حکومت کی غلط پالیسی پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے

"(حج کے لیے) کوٹہ سسٹم کسی غیرمسلم ملک نے بھی نافذ نہیں کیا۔ جبکہ ہمارے ہاں حج پالیسی کی بنیاد ہی کوٹہ سسٹم پر ہے۔ اس طرح پاکستان کے عازمینِ حج کو زرِ مبادلہ بھی کم دیا جاتا ہے جس سے پاکستان کے عازمینِ حج ہر لحاظ سے دوسرے عازمینِ حج کے مقابلے میں اپنے آپ کو

کم تر محسوس کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بھارت ایک غیر مسلم ملک ہے جس کے بارے میں ہم دنیا کو یقین دلا رہے ہیں کہ وہاں مسلمانوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن پاکستان کے مقابلے میں بھارت سے زیادہ عازمین حج آتے ہیں اور وہ ہماری نسبت زیادہ بہتر حالت میں ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر سال دنیا کے طول عرض سے آنے والے مسلمانوں کے سامنے آتی ہے اور ہمارے ان تمام بیانات و اعلانات کی تردید کرتی رہتی ہے جو ہم بھارت میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے بارے میں جاری کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ارباب اختیار میں سے آج تک کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس طرح خواہ لاکھوں اور کروڑوں روپے کا زرمبادلہ بچا لیا جائے، پاکستان کو پہنچنے والے فوائد سے نقصانات کہیں زیادہ ہوں گے۔"

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے ہیں لیکن ہم نے یہ تفصیلات اس لیے پیش کی ہیں کہ آپ صحیح صورت حال کا جائزہ لیکر اصلاح احوال کی کوئی موثر کوشش کر سکیں۔ یہ کوئی اخباری خبریں نہیں جنہیں دشمن کا جھوٹا پروپیگنڈہ کہکر نظر انداز کیا جا سکے۔ یہ دور حاضر کے ایک بہت بڑے مبصر اور خادم دین کی تصریحات ہیں جس نے خود عرب ممالک میں چل پھر کر اپنی آنکھوں سے حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔

امریکہ اور برطانیہ کی بدعہدیوں سے ہمیں بلاشبہ زبردست نقصان پہنچا ہے لیکن یہ نقصان بھی ہمارے لیے مفید ہو سکتا ہے اگر یہ چوٹ ہمیں خواب غفلت سے بیدار کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ دشمن کی فریب کاریاں اور عیاریاں ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتیں اگر ہم بیدار مغز ہوتے اور صورت حال کو صحیح طور پر سمجھنے کی قابلیت و صلاحیت رکھتے۔ آج ہم دوستوں کے جھرمٹ میں رہکر بھی اپنے آپ کو بالکل اجنبی پاتے ہیں اور معاہدوں کی جکڑبندیوں میں جکڑ کر بھی اپنے آپکو بے یار و مددگار محسوس کرتے ہیں۔ ہم پر بے بسی کا عالم طاری ہے۔ خدا کرے کہ ہماری یہ افسوسناک حالت ہماری آنکھیں کھول سکے اور ہم غیروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنے خدا پر اعتماد کرنا سیکھیں اور دوسروں کی امداد پر جینے کی بجائے اپنی دنیا خود آباد کرنے کی فکر کریں۔

(باقی صـ ۶۱ پر)

تفہیم القرآن

یٰسٓ

نام | آغاز ہی کے دو حرفوں کو اس سورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اندازِ بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس سورے کا زمانۂ نزول یا تو مکہ کے دَور متوسط کا آخری زمانہ ہے، یا پھر یہ زمانۂ قیام مکہ کے آخری دَور کی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع و مضمون | کلام کا مدعا کفارِ قریش کو نبوت محمدی پر ایمان نہ لانے اور ظلم و استہزاء سے اس کا مقابلہ کرنے کے انجام سے ڈراتا ہے۔ اس میں انذار کا پہلو غالب اور نمایاں ہے مگر بار بار انذار کے ساتھ استدلال سے تفہیم بھی کی گئی ہے۔

استدلال تین امور پر کیا گیا ہے:

توحید پر آثارِ کائنات اور عقلِ عام سے،

آخرت پر آثار کائنات، عقلِ عام اور خود انسان کے اپنے وجود سے،

اور رسالتِ محمدی کی صداقت پر اس بات سے کہ آپ تبلیغِ رسالت میں یہ ساری مشقت محض بے غرضانہ برداشت کر رہے تھے، اور اس امر سے کہ جن باتوں کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے وہ سراسر معقول تھیں اور انہیں قبول کرنے میں لوگوں کا اپنا بھلا تھا۔

اس استدلال کی قوت پر زجر و توبیخ اور ملامت و تنبیہ کے مضامین نہایت زوردار طریقہ سے بار بار ارشاد ہوتے ہیں تاکہ دلوں کے قفل ٹوٹیں اور جن کے اندر

قبولِ حق کی تھوڑی سی صلاحیت بھی ہو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

امام احمد، ابو داؤد، نسائی، ابنِ ماجہ اور طبرانی وغیرہ نے مَعقِل بن یَسار سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یٰس قلب القراٰن یعنی یہ سورہ قرآن کا دل ہے۔ یہ اُسی طرح کی تشبیہ ہے جس طرح سورۂ فاتحہ کو ام القرآن فرمایا گیا ہے۔ فاتحہ کو ام القرآن قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اُس میں قرآن مجید کی پوری تعلیم کا خلاصہ آگیا ہے۔ اور یٰس کو قرآن کا دھڑکتا ہوا دل اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ قرآن کی دعوت کو نہایت پُر زور طریقے سے پیش کرتی ہے جس سے جمود ٹوٹتا اور روح میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

اِنہی حضرت معقل بن یسار سے امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اقرءوا سورۃ یٰس علی موتاکم "یہ اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰس پڑھا کرو"۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ مرتے وقت مسلمان کے ذہن میں نہ صرف یہ کہ تمام اسلامی عقائد تازہ ہو جائیں، بلکہ خصوصیت کے ساتھ اُس کے سامنے عالمِ آخرت کا پورا نقشہ بھی آجائے اور وہ جان لے کہ حیاتِ دنیا کی منزل سے گزر کر اب آگے کن منزلوں سے اس کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس مصلحت کی تکمیل کے لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر عربی داں آدمی کو سورۂ یٰس سنانے کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی سُنا دیا جائے تاکہ تذکیر کا حق پوری طرح ادا ہو جائے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

یٰسٓ [۱]۔ قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو[۲]، سیدھے راستے پر

---

[۱] ابن عباس، عِکرِمہ، ضحاک، حسن بصری اور سُفیان بن عُیَینَہ کا قول ہے کہ اس کے معنی ہیں "اے انسان" یا "اے شخص"۔ اور بعض مفسرین نے اسے "یا سیّد" کا مخفف بھی قرار دیا ہے۔ اس تاویل کی

ہو، ۲ اور یہ قرآن، غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے[۳] تاکہ تم خبردار کرو ایک ایسی قوم کو

رُو سے ان الفاظ کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

سلہ اس طرح کلام کا آغاز کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت
میں کوئی شک تھا اور آپ کو یقین دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو یہ بات فرمانے کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ
اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کفارِ قریش پوری شدت کے ساتھ حضوؐر کی نبوت کا انکار کر رہے تھے،
اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی تمہید کے بغیر تقریر کا آغاز ہی اس فقرے سے فرمایا کہ "تم یقیناً رسولوں میں
سے ہو"، یعنی وہ لوگ سخت غلط کار ہیں جو تمہاری نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ پھر اس بات پر قرآن کی قسم
کھائی گئی ہے، اور قرآن کی صفت لفظِ "حکیم" سے بیان کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے نبی
ہونے کا کھلا ہوا ثبوت یہ قرآن ہے جو سراسر حکمت سے لبریز ہے۔ یہ چیز خود شہادت دے رہی ہے
کہ جو شخص ایسا حکیمانہ کلام پیش کر رہا ہے وہ یقیناً خدا کا رسول ہے۔ کوئی انسان ایسا کلام تصنیف
کر لینے پر قادر نہیں ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لوگ جانتے ہیں وہ ہرگز اس غلط فہمی میں نہیں
پڑ سکتے کہ یہ کلام آپ خود گھڑ گھڑ کر لا رہے ہیں، یا کسی دوسرے انسان سے سیکھ سیکھ کر سنا رہے ہیں
(اس مضمون کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحات ۲۷۲ تا ۲۷۴۔ ۲۸۵ تا ۲۸۶۔
۶۴۱ تا ۶۴۳۔ جلد سوم، صفحات ۳۱۷ تا ۳۱۸۔ ۴۷۶۔ ۶۰۲۔ ۶۳۹ تا ۶۴۲۔ ۶۶۵ تا ۶۷۰۔
۷۱۱ تا ۷۱۳۔ ۷۲۴ تا ۷۲۸۔ ۷۳۰ تا ۷۳۲)

سلہ یہاں قرآن کے نازل کرنے والے کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ غالب اور
زبردست ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ رحیم ہے۔ پہلی صفت بیان کرنے سے مقصود اس حقیقت پر متنبہ
کرنا ہے کہ یہ قرآن کسی بے زور ناصح کی نصیحت نہیں ہے جسے تم نظر انداز کر دو تو تمہارا کچھ نہ بگڑے
بلکہ یہ اس مالکِ کائنات کا فرمان ہے جو سب پر غالب ہے، جس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے کوئی
طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کی پکڑ سے بچ جانے کی قدرت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اور دوسری
صفت بیان کرنے سے مقصود یہ احساس دلانا ہے کہ یہ سراسر اس کی مہربانی ہے کہ اس نے تمہاری

جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوتے ہیں[۵]۔

ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنا رسول بھیجا اور یہ کتاب عظیم نازل کی تاکہ تم گمراہیوں سے بچ کر اس راہ راست پر چل سکو جس سے تمہیں دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل ہوں۔

۵ اس آیت کے دو ترجمے ممکن ہیں۔ ایک وہ جو اوپر متن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم ڈراؤ ایک قوم کے لوگوں کو اسی بات سے جس سے ان کے باپ دادا ڈرائے گئے تھے، کیونکہ وہ غفلت میں پڑے ہوتے ہیں"۔ پہلا مطلب اگر لیا جائے تو باپ دادا سے مراد زمانہ قریب کے باپ دادا ہوں گے کیونکہ زمانہ بعید میں تو عرب کی سرزمین میں متعدد انبیاء آ چکے تھے۔ اور دوسرا مطلب اختیار کرنے کی صورت میں مراد یہ ہوگی کہ قدیم زمانے میں جو پیغام انبیاء کے ذریعہ سے اس قوم کے آباؤ اجداد کے پاس آیا تھا اس کی اب پھر تجدید کرو، کیونکہ یہ لوگ اسے فراموش کر گئے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں ترجموں میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے اور معنی کے لحاظ سے دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قوم کے اسلاف پر جو زمانہ ایسا گزرا تھا جس میں کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس نہیں آیا، اس زمانے میں اپنی گمراہی کے وہ کس طرح ذمہ دار ہو سکتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی نبی دنیا میں بھیجتا ہے تو اس کی تعلیم و ہدایت کے اثرات دور دور تک پھیلتے ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ چلتے رہتے ہیں۔ یہ آثار جب تک باقی رہیں اور نبی کے پیرووں میں جب تک ایسے لوگ اٹھتے رہیں جو ہدایت کی شمع روشن کرنے والے ہوں، اس وقت تک زمانے کو ہدایت سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور جب اس نبی کی تعلیم کے اثرات بالکل مٹ جائیں یا ان میں مکمل تحریف ہو جائے تو دوسرے نبی کی بعثت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں حضرت ابراہیم و اسماعیل اور حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیم کے اثرات ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اس قوم میں اٹھتے رہے تھے، یا باہر سے آتے رہے تھے جو ان اثرات کو تازہ کرتے رہتے تھے۔ جب یہ اثرات مٹنے کے قریب ہو گئے اور اصل تعلیم میں بھی تحریف ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مبعوث فرما دیا اور ایسا انتظام فرمایا کہ آپ کی ہدایت کے آثار نہ مٹ سکتے ہیں اور نہ محرّف ہو سکتے ہیں۔

اِن میں سے اکثر لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں، اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔[۵] ہم نے اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں، اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔[۶] ہم نے ایک دیوار اُن کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار اُن کے پیچھے۔ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے، انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا۔[۷] ان کے لیے یکساں ہے، تم انہیں

---

۵ یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ضد اور ہٹ دھرمی سے کام رہے تھے اور جنہوں نے طے کر لیا تھا کہ آپ کی بات بہرحال مان کر نہیں دینی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ فیصلۂ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اس لیے یہ ایمان نہیں لاتے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نصیحت پر کان نہیں دھرتے اور خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعہ اتمامِ حجت ہو جانے پر بھی انکار اور حق دشمنی کی روش ہی اختیار کیے چلے جاتے ہیں ان پر خود ان کی اپنی شامتِ اعمال مسلط کر دی جاتی ہے اور پھر انہیں توفیقِ ایمان نصیب نہیں ہوتی۔ اسی مضمون کو آگے چل کر اس فقرے میں کھول دیا گیا ہے کہ "تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے"۔

۶ اس آیت میں "طوق" سے مراد ان کی اپنی ہٹ دھرمی ہے جو ان کے لیے قبولِ حق میں مانع ہو رہی تھی۔ "ٹھوڑیوں تک جکڑے جانے" اور "سر اٹھائے کھڑے ہونے" سے مراد وہ گردن کی اکڑ ہے جو تکبر اور نخوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ان کی گردن کا طوق بنا دیا ہے، اور جس کبر و نخوت میں یہ مبتلا ہیں اس کی وجہ سے ان کی گردنیں اس طرح اکڑ گئی ہیں کہ اب خواہ کوئی روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آجائے، یہ اس کی طرف التفات کر کے نہ دینگے۔

۷ ایک دیوار آگے اور ایک پیچھے کھڑی کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اسی ہٹ دھرمی اور استکبار کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ نہ پچھلی تاریخ سے کوئی سبق لیتے ہیں، اور نہ مستقبل کے نتائج پر کبھی غور کرتے ہیں۔ ان کے تعصبات نے ان کو ہر طرف سے اس طرح ڈھانک لیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ انہیں وہ کھلے کھلے حقائق نظر نہیں آتے جو ہر سلیم الطبع اور بے تعصب انسان کو نظر آ رہے ہیں۔

خبردار کرو یا نہ کرو، یہ نہ مانیں گے۔[۵] تم تو اُسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے۔ جو شخص بھی ایسا ہو اسے مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دے دو۔ ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں، اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر
ا ع رہے ہیں۔[۹] ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے ع

[۵] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس حالت میں تبلیغ کرنا بے کار ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تبلیغ عام ہر طرح کے انسانوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور کچھ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا ذکر آگے کی آیت میں آرہا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں سے جب سابقہ پیش آئے اور تم دیکھ لو کہ وہ انکار و استکبار اور عناد و مخالفت پر جمے ہوئے ہیں تو ان کے پیچھے نہ پڑو، مگر ان کی اس روش سے دل شکستہ و مایوس ہو کر اپنا کام چھوڑ بھی نہ بیٹھو، کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ اسی ہجومِ خلق کے درمیان وہ خدا کے بندے کہاں ہیں جو نصیحت قبول کرنے والے اور خدا سے ڈر کر راہِ راست پر آجانے والے ہیں۔ تمہاری تبلیغ کا اصل مقصود اسی دوسری قسم کے انسانوں کو تلاش کرنا اور انہیں چھانٹ چھانٹ کر نکال لینا ہے۔ ہٹ دھرموں کو چھوڑتے جاؤ، اور اس قیمتی متاع کو سمیٹتے چلے جاؤ۔

[۹] اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نامۂ اعمال تین قسم کے اندراجات پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی اچھا یا بُرا عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے، اپنے گردوپیش کی اشیاء اور خود اپنے جسم کے اعضاء پر جو نقوش (IMPRESSIONS) بھی انسان مرتسم کرتا ہے وہ سب کے سب ثبت ہو جاتے ہیں، اور یہ سارے نقوش ایک وقت اس طرح ابھر آئیں گے کہ اس کی اپنی آواز سنی جائے گی، اس کے اپنے خیالات اور نیتوں اور ارادوں کی پوری داستان اس کی لوحِ ذہن پر لکھی نظر آئے گی، اور اس کے ایک ایک اچھے اور بُرے فعل اور اس کی تمام حرکات و سکنات کی تصویریں سامنے آجائیں گی۔ تیسرے، اپنے مرنے کے بعد اپنی آئندہ نسل پر، اپنے معاشرے پر اور پوری انسانیت

پر اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے جو اثرات وہ چھوڑ گیا ہے وہ جس وقت تک اور جہاں جہاں تک کارفرما رہیں گے وہ سب اس کے حساب میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اپنی اولاد کو جو بھی اچھی یا بُری تربیت اس نے دی ہے، اپنے معاشرے میں جو بھلائیاں یا برائیاں بھی اس نے پھیلائی ہیں، اور انسانیت کے حق میں جو پھول یا جو کانٹے بھی وہ بو گیا ہے ان سب کا پورا ریکارڈ اس وقت تک تیار کیا جاتا رہے گا جب تک اس کی لگائی ہوئی یہ فصل دنیا میں اپنے اچھے یا بُرے پھل لاتی رہے گی۔

الجزائر میں اسلام کا مستقبل

[الجزائر میں ۱۸۳۰ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک آزادی کی راہ میں جس قدر خون بہایا گیا ہے وہ اسلام کے نام پر بہایا گیا ہے۔ مگر آزادی کے بعد اس بدنصیب ملک کو بھی وہی حادثہ پیش آیا ہے جو پاکستان، انڈونیشیا، تونس اور مراکش کو پیش آچکا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد وہاں جو گروہ برسرِ اقتدار آیا ہے اس کی اکثریت الجزائر میں اسلام کے غلبہ و فروغ کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے سیکولر اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے درپے ہے۔ الجزائر کے علماء کی جماعت جو وہاں کی با اثر عوامی جماعت ہے اور جس نے تاریک ترین ادوار میں الجزائر کے اندر جہاد کی روح پھونکی ہے اور اسلام کو اور عربی زبان کو زندہ رکھنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس عنصر کا مقابلہ کرنے کے لیے بروقت میدان میں اتر آئی ہے۔ اور اس نے حکمرانوں کو صاف طور پر آگاہ کر دیا ہے کہ اگر اس ملک میں اسلام کو نظر انداز کر دیا گیا تو اسے نہ صرف الجزائری قوم کی توہین بلکہ انقلاب کے مقصد سے انحراف سمجھا جائے گا۔ علماء کے اس اعلان نے گویا الجزائر میں اسلامی انقلاب کے لیے اصل جدوجہد کا افتتاح کر دیا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ الجزائر کا مجاہد مسلمان جو دنیا کی عظیم استعماری طاقت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو من مانی کارروائی کرنے کا زیادہ موقع نہیں دے گا جو اس کے دین و ایمان سے کھیلنے کی حماقت کر رہے ہیں۔

خ ۔ ح]

الجزائری علماء کا مطالبۂ نظام اسلامی لندن کا یہودی اخبار: جیوش ابزرور اپنی ۳۱ اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں الجزائر کے نامہ نگار کے حوالے سے "اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی" کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

"الجزائر کے مذہبی رہنماؤں نے مطالبہ کیا ہے کہ "جدید الجزائر میں اسلام اور عربی زبان کو بالا تری حاصل ہونی چاہیے" الجزائری علماء نے اپنے ایک بیان میں ان قوم پرست لیڈروں پر سخت تنقید کی ہے جو الجزائر کو ایک ماڈرن سوشلسٹ اسٹیٹ بنانے اور مذہب کو ریاست کے معاملات سے بے دخل کرنے کے درپے ہیں۔ علماء نے واضح کر دیا ہے کہ اگر الجزائر میں اسلام کو ریاست کی بنیاد اور عربی زبان کو الجزائر کی سرکاری زبان قرار نہ دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ الجزائری انقلاب نے نہ صرف ان لاکھوں شہداء کے ساتھ غداری کی ہے جو جنگ آزادی میں خون کی ہولی کھیل چکے ہیں بلکہ یہ انقلاب اپنے تاریخی مقصد میں بھی ناکام ہو گیا ہے۔"

معاہدۂ ایویان میں یہ صراحت ہے کہ الجزائر کا جو دستور بنایا جائے اس میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی جائے اور فرانسیسی اور عربی زبانوں کو ریاست کی سرکاری زبانیں قرار دیا جائے۔ دستور کا خاکہ مرتب کرنے کا کام جنرل کونسل کے سپرد کیا گیا تھا لیکن جنرل کونسل تدوینِ دستور کے سلسلہ میں متعدد مرتبہ اپنے اجلاس ملتوی کر چکی ہے۔ اور آخر کار یہ طے تھا کہ ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کو اس کا حتمی اجلاس ہوگا لیکن اس تاریخ کو بھی اجلاس منعقد نہ ہو سکا اور فوجی لیڈروں اور سیاسی رہنماؤں کے مابین مسلسل رسہ کشی کی وجہ سے غیر معین عرصہ کے لیے معرضِ التوا میں ڈال دیا گیا۔

لیکن الجزائر کے علماء نے، فرانسیسی تسلط کے خاتمہ کے بعد، اب پہلی مرتبہ اپنے ایک پبلک بیان میں کھل کر اعلان کر دیا ہے کہ "صرف سیاسی آزادی اور اقتصادی ترقی ہی الجزائر کے انقلاب کا مقصد قرار نہیں دیئے جا سکتے"۔ علماء کے بیان کے یہ الفاظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: ہر قوم (نظریات و عقائد کے لحاظ سے) اپنا جداگانہ تشخص رکھتی ہے۔ اگر یہ امتیاز ختم کر دیا جائے تو تمام قومیں سمندر کی مچھلیاں بن کر رہ جائیں، اور الجزائری، فرانسیسی اور ہسپانوی سب ایک قوم قرار پائیں۔ اگر اس نقطۂ نظر کے مطابق ہم نے الجزائر کی تعمیرِ نو کا آغاز کیا تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ الجزائر ایک کھلی بین الاقوامی ریاست

میں تبدیل ہو جائے گا، لیکن ہم اس نظریے کے مخالف ہیں۔ ہم الجزائری ہیں اور ایک مستقل قومی شخصیت کے حامل ہیں جس کا تانا بانا ہمارے مذہب: اسلام، ہماری زبان: عربی اور ہماری روایات اور ہماری تاریخ سے مرکب ہے۔ جو لوگ اسلام کو امور ریاست سے بے دخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، علماء کے بیان نے ان کی کوششوں کو "انقلاب کی بنیادوں سے انحراف، امتِ مسلمہ کے اندر رہ کر اسلام پر حملہ، اور پوری الجزائری قوم کی توہین" قرار دیا ہے۔

مغرب کی مسیحی صحافت کا جدید رجحان اسلام آج کل مغرب کی مسیحی صحافت کی نگاہ میں غیر معمولی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اسلام کی موجودہ بیداری اور مغرب عربی کی ریاستیں اور علی الخصوص الجزائر کے اسلامی مستقبل پر اس کی خصوصی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کلیسا نے جہادِ الجزائر کو وسیع الاثر اسلامی بیداری کا ایک مظہر قرار دیا ہے۔ خواہ یہ اثر اسلام کے فروغ کے امکانات کے حق میں ہو اور خواہ مسیحی سرگرمیوں کی حد تک۔ مسیحی صحافت کی یہ دلچسپی اور الجزائری جہاد کے بارے میں کلیسا کی یہ رائے مسلم حلقوں کے لیے انتہائی قابلِ غور ہے۔ اور اس امر پر یقین کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ مغربی سامراج مسلمان ممالک میں صرف اقتصادی اغراض لے کر نہیں داخل ہوا بلکہ تبلیغی مقاصد و نظریات کے تحت آیا ہے۔ چنانچہ ہم فرانس کے مسیحی مشنریوں کو قضیۂ الجزائر کے بارے میں عیسائیوں کے موقف کے متعلق طرح طرح کی معنی خیز پیشگوئیاں کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ ان میں سے زیرک اور دور اندیش گروہ کی رائے یہ تھی کہ الجزائر کی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے دور اس نتائج کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ساتھ عداوت کے اظہار میں احتیاط برتی جائے کیونکہ یہ نتائج مزید تلخ ہو جائیں گے اگر عیسائیوں نے مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کے خلاف موقف اختیار کیا۔ اب جبکہ الجزائر کی سرزمین سے استعماری نفوذ زائل ہو چکا ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغرب الجزائر کی جنگ کو اسلامی جہاد سمجھ کر وہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مقابلے میں ایک طرف فروغِ مسیحیت کے مستقبل پر خاص توجہ صرف کر رہا ہے اور دوسری طرف وہاں اپنے اقتصادی تحفظات کا اہتمام کر رہا ہے۔

اپنے مذکورہ قیاسات کی صحت پر ہم بطور نمونہ چند اخبارات کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ تاکہ الجزائر کے مسلمان حقیقتِ حال سے باخبر ہوں اور اپنے وجود کے تحفظ کے لیے اپنے دینی وسائل کو بروئے کار لائیں۔ یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ مسلمانوں کے وجود کا تحفظ و بقا اور باعزت طور پر اپنے حقوق کا حصول صرف اسلام کی بدولت ہو سکتا ہے اور ان کا مستقبل صرف اسلام کی پیروی اور اسلامی تعلیمات کے فروغ سے وابستہ ہے۔

مسلمانوں سے بہتر تعلقات استوار کرنے کی اسکیم سوئٹزرلینڈ کا ایک اخبار "جنیوا ٹریبون" ۷ جولائی ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں بزیرِ عنوان "کیتھولک مسلمانوں کو مسجدیں واپس کر دیں" لکھتا ہے:

"الجزائر کی آزادی کے بعد پہلی مرتبہ جمعہ کے روز دارالحکومت الجزائر کے گرجا میں ہنگامہ برپا ہوا۔ سینکڑوں مسلمان گرجا کے ہال میں گھس گئے۔ ایک امام صاحب منبر پر چڑھ گئے اور انہوں نے حاضرین کو اکسایا کہ وہ اس گرجا کی واپسی کا مطالبہ کریں کیونکہ یہ پہلے مسلمانوں کی مسجد تھا۔"

اس مقالے کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"آزاد الجزائر میں کیتھولک چرچ اور اسلام کے مابین اسبابِ نزاع کی کمی نہیں ہے خاص طور پر یہ صورت ان مساجد کے بارے میں نمایاں طور پر سامنے آتی ہے جو مسلمانوں سے چھین کر گرجوں میں تبدیل کی گئی ہیں جس کی ایک مثال قسطنطنیہ کا گرجا ہے۔ فرانس کے کثیرالاشاعت کیتھولک میگزین "انٹرنیشنل کیتھولک انفرمیشنز" کے ایک کالم نویس نے حال ہی میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ الجزائر کے ان مذہبی مقامات کی، جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مابہ النزاع ہیں، دینی حیثیت ختم کر کے انہیں میوزیم میں تبدیل کر دیا جائے لیکن اس تجویز کو کوئی شخص مذہبی رواداری پر محمول نہیں کر سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ ناحق طور پر جو عمارتیں مسلمانوں سے چھینی گئی ہیں انہیں واگزار کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہاں ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آجکل یہ افواہ عام گشت کر رہی ہے کہ آزاد الجزائر ویٹیکن کے ساتھ معاہدہ کرنے والا ہے۔ یہ بات بظاہر قابلِ امکان ہے۔ لیکن اس سے الجزائر کے راہبوں

اور ویٹکین کی مذہبی کونسل کے ارکان کی شہریت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ اور اس امر کا کوئی یقین نہیں ہے کہ یہ تمام افراد الجزائری شہریت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے"۔

صلیبی جنگ کے خاتمہ کا معنی خیز اعلان | پیرس کے مشہور اخبار "ٹریبون آف نیشنز" (TRIBUNE dES NATIONS) نے حال ہی میں ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس کا عنوان ہے "کیا صلیبی جنگیں ختم ہو گئی ہیں؟"۔ اس مقالے میں وہ لکھتا ہے: "آٹھ صدیاں گزرنے کے بعد لازم ہو گیا تھا کہ بحر ابیض بھی دائرہ امن میں داخل ہو۔ چنانچہ اب اسلام اور یورپ کی ملی بھگت بحر ابیض میں امن کے قیام پر مہر تصدیق ثبت کرے گی"

مسلمانوں سے اتحاد کے نئے رشتوں کی تلاش | یہ اخبار بحر ابیض کی مسلمان قوموں کی مرکزی حیثیت کا ذکر کرنے مسلمانوں کی سیاسی اور جغرافی وحدت پر داد تحسین دینے اور عالمی ثقافت میں مسلمانوں کے اہم کردار کا اعتراف کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ قضیہ الجزائر کے حل کو پورے مشرق عربی میں بڑی مسرتوں اور شادمانیوں کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا ہے۔ اخبار نے اس سلسلہ میں اُن بیانات کا ذکر بھی کیا ہے جو مشرق عربی کے بعض نمایاں رہنماؤں کی طرف سے فرانس کے موقف پر اظہار پسندیدگی کے بارے میں دیئے گئے ہیں۔ آگے چل کر یہ اخبار لکھتا ہے کہ یہاں کچھ اور وجوہ بھی ہیں، جو سیاسی خیر سگالی سے زیادہ اہم اور عمیق ہیں اور مشرق کے عربی ممالک کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ فرانس کی طرف اہتمام کے ساتھ متوجہ ہوں من جملہ اُن اسباب کے یہ بھی ہیں:

"مشرق کے عربی ممالک نے اپنے مقاصد و نظریات سے مطابقت رکھنے والی داخلی اور خارجی سیاست کی مسلسل تلاش کی ہے۔ اس کوشش و جستجو میں ان ممالک کو مشرقی بلاک اور امریکی بلاک دونوں کے بارے میں مفید تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ممالک ابھی تک اپنے مسائل کے موزوں حل کا سراغ نہیں پا سکے۔ سرمایہ دارانہ حل ہو یا مارکسی حل دونوں ان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ دونوں حل اگرچہ بظاہر متضاد ہیں لیکن اس نقطے پر یہ دونوں آکر مل جاتے ہیں کہ یہ شہری آبادیوں اور عام مزدوروں کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر وضع کیے گئے ہیں جب کہ دنیائے عرب کاشتکاروں اور دیہی آبادیوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے

دونوں بلاکوں کا کوئی حل بھی دنیائے عرب کے مناسبِ حال نہیں ہے۔ فرانس کو بھی اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں امریکی بلاک اور مارکسی بلاک کے درمیان استقرار نصیب نہیں ہے۔ کیونکہ فرانس بھی زرعی ملک ہے اور دنیائے عرب کی طرح اُسے بھی مناسبِ حال حل کی تلاش ہے۔ معاہدۂ ایویان فرانس کو اس تیسرے بلاک (یعنی زرعی بلاک) میں داخل کر دے گا۔ کیونکہ آج کے بعد فرانسیسی باشندے اور مزدور ہی الجزائر کے حقیقی سوشل انقلاب کی مالی پشت پناہی کریں گے۔ اس سے خود فرانس کے موجودہ قوانین بھی لامحالہ متاثر ہوں گے گویا الجزائر کے آئندہ حالات فرانس کے مستقبل کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیں گے۔ اور چونکہ الجزائر وسیع تر عظیم عربی جسم (یعنی عرب ممالک) کا ایک عضو ہے لہٰذا ناگزیر طور پر فرانس کا تعلق بحرابیض کے قریبی عرب ممالک کے ساتھ بھی استوار ہو جائے گا۔ اور ان ممالک کو فرانس کے تجربات سے استفادہ کرنے کا موقع ملے گا جو انہیں ایک ایسے دستوری نظام کو اختیار کرنے پر تیار کریں گے جو تمام قدیم اور آزمودہ حلوں سے بڑھ کر ہو گا . . . . اور طبعی طور پر فرانس اور اسرائیل کے مستحکم تعلقات بھی قریب قریب ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان تعلقات کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ اسرائیل موجودہ پوزیشن میں مشرقِ اوسط کا ایک معطّل عضو ہے اور تاریخ کا قاضی ایسے عضو کو مسترد کر دینے کا فیصلہ دیتا ہے۔ تل ابیب کی یہ سخت غلطی ہے کہ وہ اپنی ناکامی کی ذمہ داری رہنما کونسل کی کسی شخصیت پر ڈالتا ہے

خونریز صلیبی جنگ کے بعد پُرامن جنگ کا آغاز

مقالہ نگار اپنا مقالہ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے:

"صلیبی جنگوں کا خاتمہ اب ایک تھکے ہوئے لشکر کو ستانے پر مجبور کرے گا۔ اور ان دانشوروں سے گوشۂ عافیت میں پناہ لینے کا مطالبہ کرے گا جو پرانی ڈگر پر اخلاقیات کا درس دیتے رہے ہیں۔ اور جن کی اکثریت اسلام کو ایک خیالی مذہب سمجھتی رہی ہے۔ لیکن جو لوگ ناگہانی حالات کا سامنا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور مسائل کا جائزہ گزشتہ صدی کی عینک سے لینے کے بجائے بیسویں صدی کی روشنی میں لینے کی اہمیت

رکھتے ہیں وہ آنے والی نسلوں کو ایسے مفید تجربات سے نوازیں گے جو انہیں قوموں سے مل کر رہنے کا درس دیں۔

ہمیں چھٹی صلیبی جنگ کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو تیرھویں صدی میں ایک نادر شخصیت فریڈرک دوم نے لڑی تھی۔ فریڈرک دوم جرمنی کا شاہنشاہ اور صقلیہ کے حکمران خاندان کا آخری وارث تھا۔ یہ شخص اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اور اپنے دربار میں بھی فلاسفر کو اور علمائے اسلام کو جمع رکھتا تھا۔ اس نے پوپ کے اصرار پر ارضِ مقدس میں پُرامن صلیبی جنگ کا آغاز کیا جس میں خونریزی کے بجائے باہمی گفتگو اور تبادلۂ خیالات کو ترجیح دی چنانچہ ۱۱ فروری ۱۲۲۹ء کو یافا میں اسکی کوششوں سے جو معاہدہ ہوا اور اس میں اُسے جو حیرت ناک کامیابی حاصل ہوتی وہ اُس کے پیشروؤں میں سے کسی بڑے سے بڑے بطل کو تلوار استعمال کرنے کے باوجود بھی حاصل نہ ہو سکی۔ فریڈرک دوم کا یہ کمال نہیں تو اور کیا تھا کہ اُس نے سلطان کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ سلطان تینوں مقدس شہر (بیت المقدس بیت لحم اور ناصرہ) دوستانہ طور پر مسیحی دنیا کو واپس کر دے۔ چنانچہ یہ معاہدہ مسلمان حلقوں کے شدید غم و غصہ کے باوجود نافذ ہوا۔ معاہدہ یافا فرنج اور مسلم تعلقات کی تاریخ میں ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ جس طرح وہ خون اپنی قیمت رکھتا ہے جو بروقت بہایا گیا ہو اسی طرح امن کے اندر بھی اتنی قوت ہے کہ وہ انسانیت کو اپنے حیران کن ثمر سے شاد کام کرے۔"

(ماخوذ از المسلمون۔ جنیوا)

نبوّت کی ضرورت

(۶)

عبد الحمید صدّیقی

ترجمان القرآن کے گذشتہ شماروں میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ انسان کے داخلی تجربات، اور خارجی مشاہدات میں کوئی تجربہ اور مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو انسان کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکے۔ داخلی تجربات میں انسان کے ذاتی احساسات کافی حد تک دخیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح خارجی مشاہدات پر اُس کے ذاتی تصورات کی پرچھائیں پڑ کر انہیں بڑی حد تک رنگدار بنا دیتی ہے اس لیے اُن میں وہ معروضیت (Objectivity) پیدا نہیں ہو سکتی جو سائنس دانوں کے پیشِ نظر ہوتی ہے اور جسے وہ سائنس کا طغرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ سارے تجربات اور مشاہدات عقل کی رہینِ منت ہیں جو ان بے جوڑ کڑیوں کو علت و معلول کی جکڑ بندیوں میں جکڑ کر ان سے نتائج برآمد کرتی ہے۔ اگر عقل ان تجربات کی قدم قدم پر دستگیری نہ کرتی اور انہیں اسباب اور نتائج کے سلسلوں میں نہ جوڑتی تو ان تجربات کی قطعاً کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ لہٰذا یہ تجربات اپنی افادیت کے لیے انسانی عقل و فکر کے ہر لحاظ سے دست نگر ہیں اور اسی کے طفیل اُن کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

تجربہ اور مشاہدہ کو جس قوت نے مفید اور کار آمد بنایا ہے وہ عقل انسانی ہے۔ آئیے اب یہ دیکھیے کہ کیا تنہا عقل انسان کی رہنمائی کا اہم فریضہ ادا کر سکتی ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح انسان اپنے رہنے کے لیے مکان بناتا ہے، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے لباس تیار کرتا ہے، اپنے تجربات اور مشاہدات کو محفوظ کرنے کے لیے

قلم وقرطاس کو استعمال میں لاتا ہے، بیمار ہونے کی صورت میں مختلف ادویات سے فائدہ اٹھاتا ہے، خوراک حاصل کرنے کے لیے زمین کا سینہ چیر کر مختلف قسم کی فصلیں اگاتا ہے، دور دراز فاصلوں کو طے کرنے کے لیے تیز رفتار سواریاں ایجاد کرتا ہے، بالکل اسی طرح وہ عقل کی بدولت اس امر کا بھی التزام کر سکتا ہے کہ اپنے لیے اخلاقی ضوابط و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لیے خود ہی کوئی نسخۂ کیمیا تجویز کرے۔ عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی دیتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت بن سکتی ہے اور اس کا ناخنِ تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر انسان کسی وحی اور الہام کا محتاج نہیں۔

عقل کا خود عقل پر جو کچھ رعب ہے اگر اسے نظر انداز کر کے ہم عقل کی حدود کا جائزہ لیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ عقل اپنا طبعی فریضہ سرانجام دینے میں تنہا کافی نہیں۔ وہ اپنے اس فرض کی بجا آوری میں اپنے سے کمتر سہاروں کی ہر لمحہ محتاج ہے۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے میں جس سے وہ قطعاً ناآشنا ہے اُسے ایسی معلومات سے کام لینا پڑتا ہے جو اُسے پہلے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور اگر ذرا مزید گہرائی میں اُتر کر ان مقدمات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی کہ یہ بنیادیں جن پر عقل کی رفیع الشان عمارت اٹھائی گئی ہے وہ درحقیقت محسوسات ہیں۔ آپ عقل کے طویل اور دلچسپ سفرنامہ کا مطالعہ کریں تو یہ چیز ایک واضح حقیقت کے طور پر آپ کے سامنے آئے گی کہ اس کے سفر کا آغاز حقیر محسوسات سے ہی ہوتا ہے، یہی محسوسات پھر زادِ راہ بن کر دورانِ سفر اس کے کام آتے ہیں، تجربات و مشاہدات کے دیئے جو درحقیقت محسوسات کے تیل سے ہی روشن ہوتے ہیں، اسے راہ دکھلاتے ہیں اور بالآخر محسوسات کی منزل ہی عقل کی منزلِ مقصود قرار پاتی ہے۔

پس یہ سارے مراحل جن میں حواس کام کرنے کی کوئی صلاحیت اور اہلیت نہ رکھتے ہوں عقل بھی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ اگر محسوسات کشتی ہے تو عقل اُس کے چپو یا بادبان۔ جس طرح کشتی بغیر بادبانوں کے آگے نہیں بڑھ سکتی بالکل اسی طرح عقل بھی بغیر محسوسات کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتی۔

ایک ذہین انسان جو زمین کی افادیت سے یکسر ناواقف ہو، جسے اس بات کا قطعاً کوئی علم

نہ ہو کہ اس میں بیج کس طرح بوئے جاتے ہیں، پھر اس کی کس محنت اور مشقت سے آبیاری کی جاتی ہے اور فصل تیار ہونے کی صورت میں اُسے کن طریقوں سے کاٹا جاتا ہے اور بالآخر اسے کو نسے کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ عقلی اعتبار سے غیر معمولی انسان ہونے کے باوجود اس میدان میں بالکل ناکارہ ہے۔ وہ ہزار عقل و قیاس سے کام لے لیکن اس معاملے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین نے سب سے پہلے اس کے سامنے گھاس پھونس اور خود رو پودوں کو اُگا کر اُس کے ذہن میں یہ تصوّر پیدا کیا کہ زمین کے اندر سے پودے پھوٹ سکتے ہیں۔ پرندوں نے زمین کی سطح کو اپنی چونچوں سے کھود کر اُسے یہ شعور بخشا کہ اس کے اندر ایسے بیج پلتے جاتے ہیں جو اس کی حرارت اور زرخیزی کی وجہ سے مختلف اشجار یا دوسری فصلوں کی صورت میں برومند ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُس نے بارش کے اثرات کا بھی اپنی آنکھوں سے جائزہ لیا اور یہ دیکھا کہ جب بارش ایک خاص مقدار میں برسے تو زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور اگر وہ اس نعمت سے محروم رہے تو پھر اُس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ یہ وہ انسان کے ابتدائی مشاہدات تھے جنہوں نے انسان کو دعوتِ فکر و عمل دی اور اُس کے دل و دماغ میں اس تصوّر کو بٹھایا کہ وہ اس میدان میں ترقی کرے۔ چنانچہ اُس نے لمبے اور طویل صبر آزما تجربات کے بعد زمین کی مختلف صلاحیتوں کا کھوج لگایا۔ پھر اس کے سینے کو چاک کرنے کے بھی نہایت مفید اور کار آمد طریقے دریافت کیے، اُس کی آبیاری کے لیے نہریں کھودیں۔ یہ ترقی بلاشبہ انسانی عقل کی ہی رہینِ منت ہے لیکن غور کیجیے کہ اگر محسوسات کی دنیا اُسے تجربہ اور مشاہدہ اور غور و فکر کے لیے مواد فراہم کرنے سے انکار کر دیتی تو آج اس کا حشر کیا ہوتا۔

عقل کی بے بسی اور بے چارگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ جن محسوسات کے سہارے وہ آگے بڑھتی اور ترقی کرتی ہے وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ناقص اور غیر مکمل ہیں اس لیے مجرّد عقل کے فیصلوں پر کبھی بھی پورا اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ سترھویں صدی کے ایک عالم نکولاس پیر اس نے اپنی کتاب "جستجوئے صداقت" میں نہایت واشگاف طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"غلطی کا ایک بڑا ماخذ یہ غلط یقین ہے کہ حواس جو حقیقت میں ہم کو محض عملی اغراض

کے لیے عطا ہوئے ہیں، ماہیتِ اشیاء کو ہم پر منکشف کر سکتے ہیں"۔

اسی طرح ایک دوسرا عالم مونٹین حواس کے عجز پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:

"انسان کا علم بہت ناقص ہے، اس کے حواس غیر یقینی اور خطا پذیر ہیں۔ ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ حواس کو دنیا ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی ان کی فطرت وحالت، ادراکِ حسی میں خارجی اشیاء نہیں بلکہ محض آلات جس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، حواس پر یقین کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک آلہ ہونا چاہیے جو ان کی تصدیق وتکذیب کر سکے اور پھر اس آلہ کی جانچ کے لیے ایک اور آلہ ہونا چاہیے اسی طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا۔"

اس کے علاوہ زندگی کے بے شمار گوشے ایسے ہیں جو حیاتِ انسانی میں بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر محسوسات کی گرفت سے ماوراء ہیں۔ اس بنا پر محسوسات کے سہارے چلنے والی عقل کی گاڑی جب ان نازک مقامات کے قریب پہنچتی ہے تو خود بخود رک جاتی ہے، اور اگر اس کا احمق ڈرائیور محض اپنی حماقت اور ضد سے اسے ان مقامات کے اندر لے جانے کی کوشش کرے گا جو اس کی حدادراک سے باہر ہیں تو وہ فہم وفراست کی پٹری سے اتر کر محسوسات کی ریت میں دھنس کر تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے بھی اس قسم کی بے جا جسارت کی ہے انہوں نے انسان کی فکری صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی بجائے انہیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک آدمی اٹھتا ہے اور بڑے طنطنے کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان کے وجود کا تانا بانا عناصر طبیعی کے مجموعہ سے عبارت ہے، نفس انسانی ٹھوس اجسام اور بے شعور مادہ کی ہی ترقی یافتہ صورتیں ہیں اس لیے ضمیر، وجدان، شعور احساس قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ مادی تبدیلیوں کے ساتھ خود بخود بدلتے رہتے ہیں۔ صحیح اور برحق وہ چیز ہے جس پر حواسِ خمسہ مطمئن ہوں اور ان کی تسلی اور تشفی کا سامان فراہم کر سکے۔ اس مادی فلسفے پر ایک نظامِ فکر کی تعمیر کی جاتی ہے اور ایک فرد کو اجتماعیت کے بڑے کارخانے میں اس طرح بے دریغ ہو کر استعمال میں لایا جاتا ہے جس طرح بے جان پرزوں کو ایک

بہت بڑی مشین ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی روح فنا ہونے لگتی ہے عقل اول سے آخر تک اس باطل فلسفے کی تائید کرتی ہے۔ وہ سب سے پہلے انسان کو یہ باور کراتی ہے کہ جو چیز محسوس نہیں کی جاسکتی وہ درحقیقت موجود بھی نہیں ہوتی اور جو لوگ محسوسات سے ماوراء کسی چیز کے وجود کے قائل ہیں وہ دراصل کم نظر ہیں پھر انسان کی زندگی کا مقصد بھی اسی فلسفہ کی روشنی میں متعین کیا جاتا ہے اور اسے یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ اُس کی زندگی کا مقصد اجتماعیت کی بلاچون وچرا اطاعت ہے۔ اجتماعیت اُس سے جس طرح چاہے کام لے، اُس کے ساتھ جو سلوک چاہے روا رکھے وہ ہر معاملے میں پوری طرح حق بجانب ہوگی۔

انسان کے بارے میں ان غلط تصورات میں کوئی تصور ایسا نہیں جس کی حمایت میں عقل نے دلائل کے انبار نہ لگادیئے ہوں۔ پھر ان تصورات کے برعکس بھی جو نظریات پائے جاتے ہیں اُن کی تائید بھی عقل ہی سے ہوتی ہے۔ عقل کو اس طرح مختلف بلکہ متحارب افکار و تصورات کی حمایت میں صف آراستہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کوئی بے لاگ عدالت نہیں بلکہ ایک ایسا پیشہ ور وکیل ہے جو ہر قسم کے فعل کی مدافعت پر کمربستہ ہوجاتا ہے۔ آج زنا، شراب خوری اور اسی قبیل کی دوسری بے حیائیوں کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ سب عقل ہی کے فراہم کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا، آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلہ پر متفق الرائے نہ ہوسکیں۔

یہاں انسان کے ذہن میں ایک سوال اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا انسانی عقل بالکل ناکارہ ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عقل کی افادیت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اس کی مدد سے انسان اپنے مشاہدات اور تجربات کو منضبط کرتا ہے اور پھر اسی بنیاد پر مختلف نتائج برآمد کرتا ہے جو انسانی تعمیر و ترقی کی راہ میں بڑے مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ عقل کے خلاف یہ بات البتہ قدرے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ تنہا انسان کے سارے مسائل کو حل کرنے کی قدرت و طاقت نہیں رکھتی۔ حیاتِ انسانی کے بیشمار گوشے ایسے ہیں جہاں عقل

انسانی کی رسائی قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فلسفۂ تاریخ کے بہت بڑے مفکر ابنِ خلدون نے ایک نہایت ہی فکر انگیز بحث کی ہے۔

"وہ انسان زعمِ باطل میں مبتلا ہو کر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ موجوداتِ عالم اس کے ذہن کی گرفت میں ہیں۔ لیکن یہ محض اس کی ابلہ فریبی ہے۔ بہرے آدمی کے نزدیک وجود محسوسات اربعہ اور معقولات کے دائرہ کے باہر نہیں پایا جاتا۔ اس کے نزدیک مسموعات موجودات کی فہرست سے بالکل خارج ہوتے ہیں۔ نابینا کے نزدیک مرئیات کا عالم میں وجود ہی نہیں ہوتا۔ اگر ان معذوروں کو اپنے زمانہ کے معقول لوگوں اور رائے عامہ کا اعتبار نہ ہو تو وہ ان موجودات کے وجود کی کبھی تصدیق نہ کریں، وہ تصدیق کرتے بھی ہیں تو یہ اُن کی فطرت کا تقاضا اور ان کے ادراک کی شہادت نہیں ہوتی۔ . . . پس اپنی قوتِ ادراک کی وسعت اور ہمت اور اپنے مدرکات کی تعداد کو ہمیشہ غیر یقینی سمجھو۔ اور شریعت الٰہی کی تعلیمات پر پورا پورا اعتماد کرو۔ کیونکہ شارع علیہ السلام تمہاری سعادت کا تم سے کہیں زیادہ آرزومند، اور تمہاری بھلائی کا تم سے بڑھ کر متمنی ہے، اس کی منزل تمہاری منزلِ علم سے کہیں بلند اور اس کا دائرہ تمہاری عقل کے دائرہ سے کہیں زیادہ وسیع ہے"۔ . .

"لیکن اس حقیقت سے عقل اور اس کے مدرکات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ عقل ایک صحیح میزان ہے، اس کے فیصلوں میں وثوق اور یقین پایا جاتا ہے۔ ان میں کوئی جھوٹ نہیں ہوتا۔ لیکن تم اس ترازو میں امورِ توحید، امورِ آخرت، حقیقتِ نبوت، حقائق صفاتِ الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماورائے عقل ہیں تول نہیں سکتے۔ اور اس قسم کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ ناکام و نامراد رہے گی۔ یہ جسارت اُس شخص کی جسارت کی طرح ہو گی جس نے سونے کا وزن کرنے والی ترازو میں پہاڑوں کو تولنے کا عزم کیا۔ یہ بات قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ترازو میں کوئی نقص ہے، یا اس کی صحت محلِ نظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترازو کی صلاحیت کی ایک حد ہے۔ اسی طرح

عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی - وہ اللہ اُس کی صفات کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے؂"۔

دورِ حاضر کے ایک مشہور مفکر الڈس ہکسلے نے بھی اپنی مشہور کتاب ذرائع اور مقاصد پر اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے اور بڑے واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ عقل بہت سے معاملات میں انسان کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی:

"دورِ جدید کے انکشافات نے اس حقیقت کو پوری طرح منکشف کر دیا ہے کہ عقل و فہم اور حسی تجربات پوری دنیا کے ایک نہایت ہی مختصر سے حصے کا احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی اس کوتاہی کی دو بڑی وجوہات ہیں:

اول ہم مکان کے اعتبار سے ایک حد کے اندر مقید ہیں۔ کائنات کے بعض دور دراز گوشے ایسے بھی ہیں جن کے متعلق ہمیں براہِ راست کسی قسم کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا اور اگر قیاس کی مدد سے بھی ہم کسی نتیجہ تک پہنچنا چاہیں تو وہ معلومات بھی نہایت حقیر ہوتی ہیں"۔

دوسرے وہ ذرائع جن کے سہارے ہم خارجی دنیا سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں وہ حقیقت کا کماحقہٗ ادراک کرنے کی قوت و طاقت نہیں رکھتے۔ یہ چیز نتائج کے اعتبار سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

انگلستان کے مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے فہم انسانی میں اس حقیقت کا نہایت سلجھے ہوئے انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"انسانی عقل مخلوق ہے، اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت وہ اذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے"۔

؂ مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۶۰ باب فی علم الکلام

ایک دوسرے مقام پر انسانی عقل کی حدود کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مکمل سے مکمل فلسفہ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے۔ جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرار کائنات کی نہیں صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان کی کمزوری اور کور چشمی کا تماشا دکھنا دکھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے۔"

عقل کو زندگی کا رہنما بنانے کے لیے صرف یہی چیز ضروری نہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کی پوری طرح محرمِ راز ہو بلکہ اس کے لیے مکمل توازن اور اعتدال کو قائم رکھنا بھی لابدی ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کے فیصلے کبھی بے لاگ نہیں ہو سکتے۔

یہ وہ اہم فرض ہے جس کی بجا آوری میں عقل ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ انسانی اعمال اور اُن کی توعلیتیں اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انہیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا اور تحلیل میں بھی وہ بے لوثی پیدا نہیں ہو سکتی جو کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ انسان کے اندر بیشمار محرکات کام کرتے ہیں۔ ایک طرف شعور اور لاشعور کی قوتیں کارفرما ہیں، دوسری طرف جذبات و احساسات انسان کے اندر مختلف انداز سے انگیخت کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس کی جبلتیں اُسے سرگرم عمل رکھنے میں مشغول رہتی ہیں۔ پھر ضمیر اور وجدان کے لطیف اشارے بھی اُس کے فکر و عمل پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ عمل کے ان لاتعداد محرکات کا پوری طرح احاطہ کرنا اور پھر ان میں سے ہر ایک کو اُس کے مرتبہ اور مقام پر اس طریق سے رکھنا کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو ایک ایسی نازک ذمہ داری ہے جس سے عقل کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

(بقیہ مطبوعات)

انتظار | تالیف جناب اسعد گیلانی ۔ ناشر: آزاد بک ڈپو، بلاک نمبر ۲، سرگودھا ضخامت ۱۱۲ صفحات ۔ قیمت ایک روپیہ

جناب اسعد گیلانی صاحب تحریک اسلامی کے صفِ اوّل کے کارکن اور صاحبِ دل ادیب ہیں ۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے انسان کے دل میں اپنے مقصد سے عشق اور گہری وابستگی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے اپنے اندر ایک زبردست تڑپ پاتا ہے ۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی فاضل مصنف کے "دل کی بیتابی" پوری طرح نمایاں ہے اور اس بے تابی کو وہ پڑھنے والوں کی طرف بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

انتظام کتب خانہ | تالیف: جناب شیخ محبوب قریشی ۔ ناشر: محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد کالونی ۱/۴ صفحات ۸۶ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ۔

اس مفید کتاب میں کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کے متعلق مفید اور فنی معلومات مہیا کی گئی ہیں ۔ اس سے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ نیز وہ لوگ جن کے ذاتی کتب خانوں میں کتابوں کا ذخیرہ ہو وہ بھی اُن کی ترتیب میں اس سے حسبِ خواہش رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں ۔

ترجمان القرآن کا منصب رسالت نمبر

اس ضخیم نمبر کی چند کاپیاں دفتر میں باقی رہ گئی ہیں ۔ ضرورت مند اصحاب فوری توجہ فرمائیں ۔ قیمت فی پرچہ تین روپے ۵۰ پیسے ۔ دو سے زائد پرچوں کی خریداری پر ۲۵ فیصد رعایت ۔

مینجر

(بقیہ اشارات ۔ صفحہ ۶۴ سے آگے)

سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۔

وہ مومنوں کے آگے نہایت عاجز و نرم ہونگے مگر کفار پر سخت ۔ اللہ کی راہ میں بے خوف مجاہد ہونگے اور کسی الزام دینے والے کے الزام کی پروا نہ کریں گے ۔ یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے جسے چاہے اپنے فضل کے لیے چن لے ۔ وہ اپنے فضل میں بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کا حال جاننے والا ہے ۔

جو لوگ اس قوم کے ہمدرد اور اس کے خیر خواہ ہیں انہیں ان پرآشوب حالات میں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا اس قوم کی نیند کہیں موت کی نیند تو نہیں کہ پیہم حوادث کا شکار ہو کر اور مسلسل چوٹیں کھا کر بھی یہ بیدار نہیں ہونے پاتی ۔ جائیے تاریخ سے پوچھیے کہ کیا کسی قوم نے معصیت کی زندگی اختیار کر کے کبھی فلاح کی راہ پائی ہے ؟ کیا کسی قوم نے غفلت و اعراض کو شعار بنا کر کامرانی حاصل کی ہے ؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم نے جانتے بوجھتے یہ افسوسناک طرز عمل کیوں اختیار کر رکھا ہے ۔ اگر گزرے ہوئے واقعات سے تم کوئی سبق حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں تو خدارا ذرا آنکھیں کھول کر ان حوادثات کو تو دیکھ لو جو تمہیں ہر روز پیش آتے ہیں اور اس وحشتناک آواز کو تو سن لو جو تمہیں ہر لمحہ خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی دعوت دیتی ہے ۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ایک بار یا دو بار وہ بلاؤں میں نہ ڈالے جاتے ہوں ۔ پھر بھی اُن کی غفلت کا یہ حال ہے کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں اور نہ مصائب سے نصیحت پکڑتے ہیں ۔

رسائل و مسائل

تعبیرِ دستور کا حق

سوال۔ دستور کی تعبیر کا حق کس کو ہونا چاہیے؟ مقننہ کو یا عدلیہ کو؟ سابق دستور میں یہ حق عدلیہ کو تھا اور موجودہ دستور میں یہ حق عدلیہ سے چھین کر مقننہ کو ہی دے دیا گیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عدالتوں کے اختیارات کو کم کر دیا گیا ہے اور یہ حق عدلیہ کے پاس باقی رہنا چاہیے۔ اس مسئلہ پر ایک صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ اسلام کے دورِ اوّل میں عدالتوں کا کام صرف مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ قانون کی تشریح اور تعبیر کا حق عدالتوں کو نہ تھا اور نہ عدالتیں یہ طے کرنے کی مجاز تھیں کہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ یہ رائے کہاں تک درست ہے؟

جواب۔ موجودہ زمانے کے قانونی و دستوری مسائل پر اسلام کے دورِ اوّل کی نظیریں چسپاں کرنے کا رجحان آج کل بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن جو لوگ اس طرح کے استدلال کرتے ہیں وہ ہمیشہ اس عظیم الشان فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اُس وقت کے معاشرے اور ہمارے آج کے معاشرے میں، اور اُس وقت کے کارفرماؤں اور اس دور کے کارفرماؤں میں فی الواقع موجود ہے۔

خلافتِ راشدہ میں خلیفہ خود قرآن و سنت کا بہت بڑا عالم ہوتا تھا اور اس کی متقیانہ سیرت کی وجہ سے مسلمان اُس پر اعتماد رکھتے تھے کہ زندگی کے کسی مسئلے میں بھی اس کا اجتہاد کبھی دین کے راستے سے منحرف نہ ہوگا۔ اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان بھی سب کے سب بلا استثناء اس بنیاد پر رکنیت کا شرف حاصل کرتے تھے کہ وہ قوم میں سب سے زیادہ دین کے جاننے اور سمجھنے والے ہیں۔ اُن کے زمرے میں کوئی ایسا آدمی بار نہیں پا سکتا تھا جو دین سے جاہل ہو، یا نفسانیت

کی بنا پر دین میں تحریف کرنے والا ہو، یا جس سے مسلمانوں کو کسی بدعت یا غیر اسلامی رجحان کا اندیشہ ہو۔ معاشرے کی عظیم اکثریت بھی اُس وقت دین کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور کوئی شخص اُس ماحول میں یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی رُوح کے خلاف کوئی حکم دے یا کوئی قاعدہ و ضابطہ جاری کرے۔ یہی بلند معیار اُس وقت کی عدالتوں کا بھی تھا۔ منصبِ قضا پر وہ لوگ سرفراز ہوتے تھے جو قرآن و سنت میں گہری بصیرت رکھتے تھے، کمال درجہ کے متقی و پرہیزگار تھے، اور قانونِ خداوندی سے بال برابر بھی تجاوز کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان حالات میں مقننہ اور عدلیہ کے تعلقات کی وہی نوعیت تھی جو ایسے معاشرے میں ہونی چاہیے تھی۔ تمام جج مقدمات کے فیصلے براہِ راست قرآن و سنت کے احکام کی بنیاد پر کرتے تھے، اور جن امور میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی تھی اُن میں بالعموم وہ خود اجتہاد کرتے تھے۔ البتہ جہاں معاملات کی نوعیت اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ جج اپنے انفرادی اجتہاد سے فیصلہ نہ کریں بلکہ خلیفہ کی مجلسِ شوریٰ اُن میں شریعت کا حکم متحقق کرے، اُن کے بارے میں اجتماعی اجتہاد سے ایک ایسا ضابطہ بنا دیا جاتا تھا جو دین کے اصولوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہو سکتا تھا۔ اس نظام میں کوئی وجہ نہ تھی کہ ججوں کو مجلسِ شوریٰ کے بنائے ہوئے قانون پر نظرثانی کرنے کا اختیار ہوتا۔ کیونکہ وہ اگر کسی قانون کو رد کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے تو اسی بنیاد پر تو ہو سکتے تھے کہ وہ اصل دستور (یعنی قرآن و سنت) کے خلاف ہے۔ اور قانون وہاں سرے سے کسی ایسے معاملہ میں بنایا ہی نہیں جاتا تھا جس کے متعلق قرآن و سنت میں واضح حکم موجود ہو۔ قانون سازی کی ضرورت صرف اُن معاملات میں پیش آتی تھی جن میں نص موجود نہ ہونے کی وجہ سے اجتہاد ناگزیر ہوتا تھا۔ اور ایسے معاملات میں ظاہر ہے کہ انفرادی اجتہاد کی بہ نسبت اجتماعی اجتہاد زیادہ قابلِ اعتماد ہو سکتا تھا، خواہ بعض افراد کا ذاتی اجتہاد اس سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔

اب ظاہر ہے کہ اُس وقت کی یہ دستوری نظیر آج کے حالات پر کسی طرح بھی چسپاں

نہیں ہوتی ۔ نہ آج کے حکمراں اور مجالسِ قانون ساز کے ارکان خلفائے راشدین اور ان کی مجلسِ شوریٰ سے کوئی نسبت رکھتے ہیں، نہ آج کے جج اُس وقت کے قاضیوں جیسے ہیں، اور نہ اِس دور کی قانون سازی اُن حدود کی پابند ہے جن کی پابندی اُس دور میں کی جاتی تھی۔ اِس لیے اب آخر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ ہم اپنے دستوری ضابطے اس وقت کے حالات کو سامنے رکھ کر تجویز کریں اور خلافتِ راشدہ کی نظیروں پر عمل شروع کرنے سے پہلے وہ حالات پیدا کرنے کی فکر کریں جن سے وہ نظیریں عملاً تعلق رکھتی تھیں۔ موجودہ حالات میں جہاں تک شرعی معاملات کا تعلق ہے، آخری فیصلہ نہ انتظامیہ پر چھوڑا جا سکتا ہے، نہ مقننہ پر، نہ عدلیہ پر اور نہ مشاورتی کونسل پر۔ ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ مسلمان شرعی امور میں اس پر کامل اعتماد کر سکیں۔ شریعت کو مسخ کرنے والے اجتہادات سے امن میسر آنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عام کو بیدار کیا جائے اور قوم بحیثیتِ مجموعی اس قسم کے ہر اجتہاد کی مزاحمت کے لیے تیار ہو۔ رہے عام دستوری مسائل، جن میں شریعت کوئی منفی یا مثبت احکام نہیں دیتی، ان میں مقننہ کو آخری فیصلہ کُن اختیارات دے دینا بحالات موجودہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک غیر جانبدار ادارہ ایسا موجود ہونا چاہیے جو یہ دیکھ سکے کہ مقننہ نے کوئی قانون بنانے میں دستور کے حدود سے تجاوز تو نہیں کیا ہے۔ اور ایسا ادارہ ظاہر ہے کہ عدلیہ ہی ہو سکتا ہے۔

سحری کے اوقات اور ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ

سوال۔ آج کل بعض حضرات نے مولانا مودودی کے خلاف الزامات تراشی کا جو محاذ قائم کر رکھا ہے اس نے بعض سنجیدہ حضرات کو بھی شکوک و شبہات میں ڈال دیا ہے۔ مولانا کی بعض تحریروں کے خلاف اعتراضات وارد کیے جا رہے ہیں، اس لیے ان

تحریروں کی توضیح ضروری ہے۔ ان وضاحت طلب تحریروں میں سے ایک وہ ہے جس میں قرآن و حدیث کی رو سے سحری کے اوقات بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ رمضان میں کھانے پینے کے اوقات کس وقت ختم ہوتے ہیں۔ اسے قطعی طور پر قرآن و حدیث کے منشا کے خلاف بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مولانا نے ایک حدیث سے اذان کے بعد بھی کچھ کھا پی لینے کا جواز نکالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہؒ نے اس سے حضرت بلالؓ کی اذان مراد لی ہے جو صبح کو نہیں بلکہ رات ہی کو ہوتی تھی۔

مولانا مودودی کے خلاف ایک مزید اعتراض یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں مشت بھر سے کم ڈاڑھی رکھنے کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ درمختار میں ہے کہ ایک مٹھی سے کم کو کسی نے جائز نہیں کہا (لم یبحہ احد) یہ گویا اجماع ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا فاسق ہے۔ براہِ کرم واضح کریں کہ مولانا مودودی کے قول کے حق میں کوئی سند موجود ہے یا نہیں؟

جواب: معترضین کا پہلا اعتراض تفہیم القرآن جلد اول، ص ۱۴۶ کی اس عبارت پر ہے:

"آج کل لوگ سحری اور افطار کے معاملے میں شدتِ احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدد برتنے لگے ہیں مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ اِدھر اُدھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ سحر میں سیاہیٔ شب سے سپیدۂ سحر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوعِ فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آجائے تو فوراً نہ چھوڑ دے، بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔"

اس عبارت پر جو مختلف اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس عبارت کا

مضمون حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ کے خلاف ہے نیز یہ کہ اس میں حدیث کا مفہوم غلط سمجھا گیا ہے اور اس سے غلط استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ اس حدیث میں دراصل حضرت بلالؓ کی اس اذان کی جانب اشارہ ہے جو طلوعِ فجر کے وقت نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے لوگوں کو اٹھانے اور سحری کھانے کے لیے دی جاتی تھی۔ معترضین کا کہنا یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔

کوئی مسلمان قرآن مجید کے اس ارشاد سے بے خبر نہیں کہ کھانا پینا اُس وقت تک جائز ہے جب تک سیاہیٔ شب کی دھاری سے سفیدیٔ صبح کی دھاری نمایاں نہ ہو جائے لیکن شفق کی طرح سحری کے خاتمہ وقت کے معاملے میں بھی سلف کے دو گروہ ہیں۔ ان کے مابین اختلاف مشہور اور اکثر کتب میں مذکور ہے بعض کے نزدیک طلوعِ فجر کے اولین آثار پیدا ہوتے ہی کھانا پینا ممنوع ہو جاتا ہے اور بعض کے نزدیک جب تک روشنی نمایاں نہ ہو جائے اس وقت تک گنجائش موجود رہتی ہے۔ یہ اختلاف خود فقہائے حنفیہ میں بھی ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ خود "المسوّٰی" میں فتاویٰ عالمگیری کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں "وفی العالمکیریہ قد اختلفوا فی ان العبرۃ لاول طلوع الفجر اولاستطارتہ وانتشارہ والاول احوط والثانی اوسع والیہ مال اکثر العلماء وفی الانوار ومعنی الصبح ظہور الضوء للناظر وما قبلہ لاحکم لہ" (عالمگیری میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا (روزے کے معاملے میں) معتبر طلوعِ فجر کا اولین وقت ہے یا وہ وقت جبکہ فجر کی روشنی ہر طرف پھیل جائے؟ ان میں سے پہلا قول زیادہ مبنی بر احتیاط ہے اور دوسرے میں زیادہ وسعت و سہولت ہے اور اسی کی طرف اکثر علماء مائل ہیں۔ اور انوار میں ہے کہ صبح کے معنی یہ ہیں کہ روشنی دیکھنے والے پر ظاہر ہو اور جو کچھ اس سے پہلے ہے اس پر کوئی حکم نہیں لگتا)۔

اس دوسرے مسلک کی تائید متعدد احادیث سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سُنن نسائی، باب السحور کی ایک روایت یہ ہے: عن زید قلنا لحذیفۃ ای ساعۃ تسحرت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو النھار الا ان الشمس لم تطلع (حضرت زید فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت

حذیفہؓ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس وقت سحری کرتے تھے۔انہوں نے جواب دیا کہ دن چڑھ آتا تھا بس سورج نکل آنے کی کسر باقی رہ جاتی تھی)

اب ابوداؤد کی اس حدیث کو لیجیے جس کا مضمون تفہیم القرآن میں نقل کیا گیا ہے اس حدیث کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں اذان سے مراد مغرب کی اذان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد طلوع فجر کی اذان ہے، لیکن اس میں کھانے پینے کی جس رعایت کا ذکر ہے اس سے فائدہ اسی حالت میں اٹھایا جا سکتا ہے جبکہ روزہ رکھنے والے کو خود صبح ہو جانے کا یقین نہ ہو ورنہ اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔اس حدیث کی ایک تاویل وہ بھی ہے جسے شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کیا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ رمضان میں ایک اذان حضرت بلالؓ طلوعِ فجر سے بہت پہلے لوگوں کو اٹھانے کے لیے دیتے تھے اور دوسری اذان بعد میں طلوعِ فجر کے وقت حضرت ابنؓ ام مکتوم دیتے تھے۔شاہ صاحبؒ یہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد کی حدیث میں جس اذان کے بعد کھانے پینے کی اجازت ہے یہ حضرت بلالؓ والی اذان ہے جو فجر سے قبل رات ہی کے آخر میں ہوتی تھی۔

شاہ صاحب کے قول سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس حدیث کی بس یہی صحیح اور قابلِ ترجیح تاویل ہے اور اس کے حق میں کوئی قوی قرینہ موجود ہے۔دراصل معالم السنن اور مرقات وغیرہ میں یہ تینوں تاویلات موجود تو ہیں (جن میں حجۃ اللہ والی تاویل بھی شامل ہے)،لیکن ان سب کو "قیل" یا "او" کے ساتھ ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور کسی ایک کو جزم و یقین کے ساتھ اختیار نہیں کیا گیا۔حق یہ ہے کہ یہ تاویلات بعض اشکالات سے خالی نہیں ہیں اور ان کے بجائے سیدھی سادی اور متبادر تاویل جو مولانا مودودی نے کی ہے وہ نہ صرف اشکالات سے محفوظ ہے، بلکہ ایک دوسری حدیث اس تاویل کی صریح تائید کر رہی ہے۔وہ حدیث امام احمد نے مسند ابی ہریرہؓ میں صحیح اور متصل سند کے ساتھ نقل کی ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں: اذا سمع احدکم النداء والاناء علی یدہ فلا یضعہ حتی یقضی حاجتہ وکان موذن یوذن اذا بزغ الفجر جب

تم میں سے کوئی اذان ایسی حالت میں سنے کہ برتن اس کے ہاتھ پر ہو تو وہ اسے نہ رکھے جب تک اپنی حاجت اس سے پوری نہ کر لے اور موذن اذان دیتا تھا جب فجر طلوع ہو جاتی تھی)۔ ابوداؤد اور احمد کی ان دونوں روایتوں کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور دونوں کے شروع کا مضمون یکساں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسری حدیث پہلی کی تفصیل بیان کر رہی ہے۔ اس تفصیل و اضافہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ حدیث میں جس اذان کے دوران میں کھا پی لینے کی رخصت کا ذکر ہے وہ رات والی اذان نہیں، بلکہ طلوعِ فجر والی اذان ہے جسے بالعموم حضرت ابن ام مکتوم دیا کرتے تھے اور مولانا مودودی کا یہ قول عین مطابقِ حدیث ہے کہ "ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوعِ فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلے تو وہ جلدی سے اٹھ کر کچھ کھا پی لے۔" یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک تخفیف و تیسیر ہے اور کوئی اللہ کا بندہ اگر اس سے فائدہ اٹھائے تو کسی کی جیب سے کچھ نہیں جاتا۔ پھر اس پر دل میں تنگی محسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

رہی یہ بات کہ اس اذان سے مراد بعض بزرگوں نے حضرت بلالؓ والی اذان لی ہے، تو ان بزرگوں کا احترام ہمارے سر آنکھوں پر، لیکن یہ تاویل کسی طرح دل کو نہیں لگتی۔ حضرت بلالؓ والی اذان تو ہوتی ہی اس غرض کے لیے تھی کہ لوگ اٹھ کر سحری کھائیں۔ اس وقت برتن ہاتھ میں ہونے، اور اس میں سے کھا لینے کی اجازت کا کیا سوال؟ اس وقت تو لوگ اٹھ کر اطمینان کے ساتھ سحری کھاتے تھے۔ جلدی سے کچھ کھا لینے کی اجازت کا سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ دوسری اذان کے وقت کسی کی آنکھ کھلی ہو، یا کسی نے دیر سے سحری کھانی شروع کی ہو اور دوسری اذان ہو جائے۔

دوسرا اعتراض مولانا مودودی کے خلاف یہ ہے کہ وہ مشت بھر ڈاڑھی کو مسنون نہیں سمجھتے حالانکہ اس پر اجماعِ امت ہے۔ اس اعتراض کا بھی جواب دینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی اصل عبارت سامنے رکھی جائے۔ مولانا نے رسائل و مسائل حصہ اول میں لکھا ہے "ڈاڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے۔ صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ آپ اگر ڈاڑھی رکھنے میں فاسقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور اتنی ڈاڑھی

دکھلیں جس پر عرفِ عام میں ڈاڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہے (جسے دیکھ کر کوئی شخص اس شبہ میں مبتلا نہ ہو کہ شاید چند روز سے آپ نے ڈاڑھی نہیں مونڈی ہے)، تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے، خواہ اہلِ فقہ کی استنباطی شرائط پر وہ پوری اترے یا نہ اُترے۔"

اس امر سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی کی کسی خاص مقدار کی تعیین فرمائی ہو۔ آنحضورؐ کا حکم عام ہے کہ ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں گھٹاؤ۔ جہاں تک اس حکم کی بجا آوری کی عملی صورت کا تعلق ہے اس میں استنباط سے کام لیا گیا ہے اور استنباط میں اختلاف بھی رونما ہوا ہے۔ بعض کے نزدیک ڈاڑھی کو بلا نہایت بڑھانا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا مقتضائے سنت ہے۔ بعض کے نزدیک مٹھی بھر ڈاڑھی مسنون ہے اور لمبی ڈاڑھی مکروہ ہے۔ بعض کے نزدیک کوئی خاص حد مقرر نہیں، بس ڈاڑھی رکھنا مشروع ہے۔ جو حضرات ایک مشت ڈاڑھی کو مسنون سمجھتے ہیں، ان کا بیشتر انحصار حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل پر ہے کیونکہ وہ قبضے سے زائد ڈاڑھی کو ترشوا دیا کرتے تھے یا صحیح تر روایت کے بموجب انہوں نے حج اور عمرے کے موقع پر ایسا کیا تھا۔ خود حضرت ابنِ عمرؓ سے کوئی صراحت ایسی مروی نہیں جس سے معلوم ہو کہ آیا وہ ایک قبضہ ڈاڑھی ہی کو مسنون سمجھتے تھے، اور مسنون ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک یہ مقدار کم سے کم کی حد تھی یا زیادہ سے زیادہ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابنِ عمر کے اس فعل کو اتباعِ سنت پر محمول کرنے کی صورت میں بھی اس سے دونوں طرح کے استنباط کی گنجائش موجود ہے۔ اگر ان کے اس فعل کو حج یا عمرے کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے تو اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقدار ان کے نزدیک کم سے کم کا درجہ رکھتی تھی اور بالعموم آپ اس سے بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ اور اگر ان کا عام عمل یہ مانا جائے کہ وہ ایک مشت سے زائد کو ترشوا لیا کرتے تھے اور ڈاڑھی کو مٹھی بھر سے زیادہ بڑھنے نہیں دیا کرتے تھے تو اس سے یہ استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقدار ان کے نزدیک زیادہ سے زیادہ کی حد تھی۔ اس طرح کے استنباط کی بنا پر اگر بعض فقہا قبضے سے زائد ڈاڑھی ترشوا دینے کو واجب

قرار دے سکتے ہیں، تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قبضے سے کم مقدار کو جائز یا مباح سمجھ لینے میں کون سا امر شرعی مانع ہے؟

باقی رہا صاحبِ درمختار وغیرہ کا یہ فرمانا کہ مٹھی بھر ڈاڑھی کی مقدار پر اجماع ہے اور اس سے کم کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا اثبات بڑا مشکل ہے۔ میں دوسرے مذاہبِ فقہیہ کو چھوڑ کر سر دست یہاں علامہ عینی حنفی کی تصنیف عمدۃ القاری، کتاب اللباس، باب تقلیم الاظفار" میں سے کچھ حصہ عبارت کا نقل کرتا ہوں جس میں وہ توفیر لحیہ والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام طبری کے حوالے سے فرماتے ہیں" قد ثبت الحجۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی خصوص ھذا الخبر ان اللحیۃ محظور اعفاؤھا وواجب قصھا علی اختلاف من السلف فی قدر ذلک وحدہ فقال بعضھم حد ذلک ان یزاد علی قدر القبضۃ طولا وان ینتشر عرضا فیقبح ذلک . . وقال آخرون یأخذ من طولھا وعرضھا ما لم یفحش اخذہ ولم یحد وافی ذلک حداً (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی دلیل ثابت ہے کہ ڈاڑھی بڑھانے کے متعلق، حدیث کا حکم عام نہیں بلکہ اس میں تخصیص ہے اور ڈاڑھی کا اپنے حال پر چھوڑ دینا ممنوع اور اس کا ترشوانا واجب ہے، البتہ سلف میں اس کی مقدار اور حد کے معاملے میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ اس کی حد یہ ہے کہ وہ لمبائی میں ایک قبضے سے بڑھ جائے اور چوڑائی میں بھی پھیل جانے کی وجہ سے بُری معلوم ہو . . بعض دیگر اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ لمبائی اور چوڑائی میں کم کرائے بشرطیکہ بہت چھوٹی نہ ہو جائے، انہوں نے اس بارے میں کوئی حد مقرر نہیں کی)۔ اس کے بعد فرماتے ہیں" غیر ان معنی ذالک عندی ما لم یخرج من عرف الناس (البتہ اس کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ ڈاڑھی کا ترشوانا اس حد تک جائز ہے کہ وہ عرفِ عام سے خارج نہ ہو جائے)۔

اب اگر ایک شخص انصاف کی نظر سے اور تعصب سے خالی ہو کر دیکھے تو وہ خود بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا مودودی کی مذکورۂ بالا عبارت اور عمدۃ القاری کی اس عبارت میں آخر کتنا ایسا بڑا فرق ہے جس کی بنا پر ایک کو تو گوارا کر لیا جائے اور دوسری کی تردید میں مخالفانہ مہم چلانا ضروری . . . . سمجھا جائے۔

مطبوعات

ہمارے تعلیمی مسائل | مرتبہ: خلیفہ صلاح الدین صاحب سیکرٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ شائع کردہ: ملک سراج الدین اینڈ سنز، پبلشرز لاہور (۸)۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے آزادی سے قبل خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی سرکردگی میں مسلمانوں کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کی وفات کے بعد اس کانفرنس پر مُردنی چھا گئی۔ اب اُن کے فرزند ارجمند کی سرپرستی میں اس مفید ادارہ نے پھر سے کام کا آغاز کیا ہے۔ زیر تبصرہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ہمارے ہاں مختلف امتحانات میں طلبہ جس کثیر تعداد میں فیل ہو رہے ہیں اس نے ایک سنگین مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے اور اسے حل کرنے کے لیے مختلف تدابیر سوچی جا رہی ہیں۔ اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے لاہور میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں اس کے متعلق مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ اب اسی جائزہ کو اس کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے۔

اس مذاکرہ میں ملک کے بہت سے نامور ماہرینِ تعلیم نے حصہ لیا ان میں پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر رفیق احمد خان، ڈاکٹر آر۔ ایم لینگ اور صوفی جمال اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ایک مبسوط مقدمہ بھی درج ہے جس کا درج ذیل حصہ بڑی اہمیت رکھتا ہے:

"(بانیٔ پاکستان) حیدرآباد تشریف لے گئے تو چند نوجوانوں نے آپ سے کچھ سوالات کیے۔ یہ مکالمہ اورینٹ پریس کی وساطت سے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

آج اس مرحلہ پر اس کے چند اقتباسات بانیٔ پاکستان کی بصیرتِ قلبی اور دوربین نگاہ کی یاد تازہ کریں گے۔

آپ سے سوال کیا گیا:

مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

آپ نے فرمایا:

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ تو کوئی مولوی ہوں نہ مُلا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی، ہو یا معاشی غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ حکیم کی اصولی ہدایت اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔" (ص ۹)

اردو ڈائجسٹ، سالنامہ | مدیر مسئول: الطاف حسن قریشی۔ مقام اشاعت: ۵ مین روڈ سمن آباد، لاہور، پاکستان۔ سالانہ چندہ چودہ روپے۔ سالنامہ کی قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے۔ صفحات ۳۰۲۔

اس دور میں جب زندگی کے ہر آن بڑھتے ہوئے تقاضوں نے عام انسانوں کو بے حد مصروف بنا دیا ہے اس چیز کی ضرورت تھی کہ اُس کے سامنے مختلف علوم و فنون اور معلومات کو نہایت آسان

پیرائے اور اختصار کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر یورپ میں مختلف قسم کے "انتخابات" شائع ہونے شروع ہوئے۔ شہرہ آفاق "ریڈرز ڈائجسٹ" بھی اسی سلسلہ کی ایک نہایت ہی اہم کوشش ہے جسے ہر طبقہ میں غیر معمولی مقبولیت ہوئی ہے۔

اُردو ڈائجسٹ کا ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اُس نے اُردو زبان میں اس خلا کو نہایت ہی اچھے طریق سے پُر کیا ہے۔ زیر تبصرہ مجلہ جو اس جریدہ کا سالنامہ ہے حسنِ انتخاب کا ایک نہایت ہی اچھا نمونہ ہے۔ شعر و ادب، طنز و مزاح، تعلیمات، نفسیات، شخصیات، حیوانیات، طب و صحت۔ الغرض زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق مستند معلومات فراہم نہ کی گئی ہوں۔ اس مجلہ میں دنیا کے مشہور مفکرین اور اہلِ علم نے حصہ لیا ہے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اور ٹالسٹائی کے نام قابلِ ذکر ہیں طنز و مزاح میں شفیق الرحمن صاحب کا مضمون "آپ نے کچھ سنا بھی" بہت دلچسپ ہے۔ مقالات میں "کلچر کے مفتے" از ڈاکٹر سید عبداللہ، "ناکام طالب علم" از پروفیسر حمید احمد خاں، "پچاس سال پہلے" از ملک نصراللہ خاں عزیز، نہایت عمدہ اور معلومات افزا مضامین ہیں۔ طب میں حکیم اقبال حسین صاحب نے یہ بتایا ہے کہ پاکیزہ جذبات عمدہ صحت کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔ شخصیات کے تحت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے انٹرویو نہایت دلچسپ ہے اور اسے پڑھکر مولانا کے فکر و نظر کے کئی گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ "زندگی کے ناقابلِ فراموش لمحات" کے تحت جسٹس ایم آر کیانی، ایس اے رحمٰن، ڈاکٹر سید عبداللہ، چودھری نذیر احمد خاں جعفر شاہ پھلواروی، حکیم نیر واسطی، ماہر القادری، اثر صہبائی، مرزا ادیب اور الطاف فاطمہ نے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔

خدا ہے | تالیف: سید حامد علی صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ شہادتِ حق، بریلی، یوپی قیمت فی نسخہ ۲۵ پیسے

اس قابلِ قدر مقالے میں فاضل مصنف نے وجودِ باری تعالیٰ پر نہایت اچھے دلائل فراہم کیے ہیں۔ اندازِ بیان بھی بڑا دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ اس فاضلانہ مقالہ کو ہر پڑھے لکھے شخص تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(باقی صفحہ ۲ پر)

(بقیہ اشارات)

اس وقت ہمارے لیے اصل پریشان کن چیز یہ نہیں کہ ہندوستان ہمارے خلاف جارحانہ عزائم رکھتا ہے یا امریکہ نے ہم سے بے وفائی کی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ہماری توقع کے خلاف نہ تھی جب مصلحت پرستی ہی کسی قوم کا ایمان ہو اور قوم پرستی اُس کا دین تو اسے ہمارے خلاف یہی روش اختیار کرنی چاہیے تھی جو ان ممالک نے کی ہے۔ ہمارے لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ یہ قومیں اگر اس سے مختلف رویہ اختیار کرتیں تو ہم یقیناً حیرت زدہ ہوتے۔ اگر ہندوستان کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی اور امریکہ کی جگہ روس ہوتا تو پھر بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا جو کہ اب کیا گیا ہے۔ کونسا بیوقوف ملک ہے جو مادیت پرستی کے اس دور میں ایک طاقتور قوم کی رفاقت اور دوستی کو چھوڑ کر ایک کمزور قوم کے لیے اپنے آپ کو قربان کریگا۔

ہمارے لیے اصل پریشان کن مسئلہ یہ ہے کہ ہم بار بار کی ٹھوکریں کھانے اور چوٹیں سہنے کے باوجود اپنی اُس روش کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ سے دوسری قومیں ہمارے ساتھ یہ ناروا سلوک کرنے کی جسارت کرتی ہیں اور خود اپنی اُن غلطیوں کو محسوس نہیں کرتے جن کی بدولت ہمیں پے در پے یہ زکیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ ہم حقائق سے مُنہ موڑ کر محض آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے چلنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جو شخص یا گروہ ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے نکال کر حقائق سے روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہے ہم اُسے اپنا دشمن اور اپنے ملک اور قوم کا دشمن سمجھنے لگتے ہیں اور اُس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو ہمیں خوش کن باتیں بنا کر ہم پر کیف و مستی کا عالم طاری کر دیتا ہے۔ ہم اُسے اپنا خیر خواہ خیال کرتے ہیں اور اُس کی اندھا دھند پیروی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ عمل کی قوت اب ہم میں قریب قریب ناپید ہو چکی ہے لیکن ہم اس تلخ حقیقت کو نہ تو سننے کے لیے تیار ہیں اور نہ اس کے تدارک کی کوئی فکر ہی کرتے ہیں بلکہ ٹھوس عمل کی کمی کو سپنوں کے محلات تعمیر کر کے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں نصیحت سے ایک قسم کی ضد اور چڑ پیدا ہو چکی ہے اور کذب و فریب اور لاف گزاف کے بیسے

ہمارے دل جذبۂ احترام سے معمور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آج تک کسی معاملہ کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم نے اپنے رہبروں اور سربراہ کاروں کے انتخاب کو کبھی بھی ایک تماشہ سے زیادہ اہمیت نہ دی اور محض ترنگ میں آکر قوم کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اس غیر سنجیدہ طرزِ عمل کے اب ہم اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ کسی اہم سے اہم قومی مسئلہ کے بارے میں بھی سنجیدگی سے غور کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم تباہ کُن حوادث میں مبتلا ہونے سے پہلے اُن کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے کہ کہیں خیالات کے قلعوں میں زلزلہ نہ آجائے اور ٹھوس حقائق سامنے آکر ہمارے لُطف کو کرکرا نہ کر دیں۔ ہماری ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر جب ہم پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگتا ہے اور تلخ حقائق کی ضربیں ہمارے خیالی قلعوں کو یک لخت منہدم کر دیتی ہیں تو پھر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں بلکہ ہم ان کی ایسی توجیہات کرنے لگتے ہیں جن سے نفس کو یہ اطمینان دلایا جا سکتے کہ ہم میں تو کوئی کمی اور خامی نہیں، ہمارا طرزِ عمل ہر اعتبار سے بالکل صحیح اور معیاری ہے صرف فلاں قوم کی غداری اور فلاں کی بے وفائی نے ہمیں اس حادثہ سے دوچار کر دیا ہے۔ پھر ہمارے جذبات میں دفعتًا ایک زبردست اشتعال پیدا ہوتا ہے اور زبانیں بالکل بے لگام ہو کر حرکت میں آنے لگتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی پوری فضا شعلۂ جوالہ بنا کر رکھ دی جاتی ہے جس کے اندر لوگ اس حادثہ اور اس کے نتائج کو فہم و فراست کی معتدل میزان پر تولنے کی بجائے جذبات کی شعلہ فشانیوں سے جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح غیروں پر غضبناک ہو کر اور انہیں بُرا بھلا کہکر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن نہ تو اپنی کمزوریوں پر غور کرنے کی کوئی زحمت گوارا کی جاتی ہے اور نہ انہیں دُور کرنے کا کوئی عزم ہوتا ہے۔ ہمارا ہدفِ تنقید صرف دوسرے ممالک اور دوسرے لوگ ہی بنتے ہیں اور اس طرح ہم اپنے آپ کو اس زعمِ باطل میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم ہر لحاظ سے مبرا عن الخطا ہیں۔ ہمارا یہ طرزِ عمل ہمارے اخلاق کو بلند کرنے اور ہمارے ارادوں کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ نہیں بلکہ درحقیقت یہ وہ افیون کی گولیاں ہیں جو ہر چوٹ کے بعد ہم اس لیے کھایا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی خامیوں کا تلخ احساس نہ ہونے پائے اور

ہماری یہی کمزوری ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔

خدا کرے کہ ہماری قوم ہماری ان گزارشات کو حسبِ عادت جذبات کے شعلوں میں جلانے کی بجائے عقل و دانش کی میزان میں تول کر دیکھے اور ہمارے ارباب لسبت وکشا د صرف زبان کے جوہر دکھانے اور غیظ و غضب کا اظہار کرنے کی بجائے اصلاحِ احوال کے لیے کوئی عملی جدوجہد کریں۔ یہ حقیقت اگرچہ تلخ ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے حالات کو تشویشناک حد تک بگاڑ دیا ہے لیکن ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ ابھی صورتِ حال کی اصلاح ہر طرح ممکن ہے۔ اگر اب بھی ہم میں ٹھوس حقائق سے دوچار ہونے کی ہمت پیدا ہو جائے اور ہم خوش کن نگر نکمی باتیں سننے کی بجائے تلخ مگر کام کی باتیں سننے کے لیے تیار ہو سکیں۔ اور اصلاح کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو آج بھی حالات ہمارے حق میں پلٹ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دنیا ذرائع اور اسباب کی دنیا ہے اور اس معاملے میں ہم دوسروں کے معاملے میں بہت کمزور ہیں لیکن تاریخ اس حقیقت کی بھی آئینہ دار ہے کہ بسا اوقات کسی قوم کے دعوے کی صداقت، اُس کے عمل کا خلوص، اُس کی نیت کی پاکیزگی اور اُس کے عزم کی پختگی، اُس کے ذرائع کی کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ خدا کا قانون آپ کی رفاقت کا تھوڑا سا سہارا چاہتا ہے۔ اگر آپ اس معاملے میں تھوڑی سی ہمّت کریں تو وہ خالق جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کی تمام قوت و طاقت ہے وہ آپ کا حامی اور مددگار ہوگا اور اس کی حمایت حاصل ہو جانے کے بعد دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت آپ کو گزند نہ پہنچا سکے گی۔ کیونکہ اُس کا وعدہ ہے وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۔

اس سلسلہ میں یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ جہاں مومنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حمایت و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور انہیں اس امر کا یقین دلایا ہے کہ اُس کی اطاعت اور فرماں برداری اختیار کر کے انہیں کبھی بھی ذلت و خواری کا منہ نہ دیکھنا پڑے گا۔ وہاں اُس نے انہیں اس بات پر بھی متنبہ کر دیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ ناپسندیدہ اور کوئی روش نہیں کہ

کوئی شخص یا گروہ زبان سے اُس کی پرستش اور اطاعت گزاری کا دعویٰ کرے لیکن عملی اعتبار سے وہ ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جو باغیوں اور سرکشوں کے عمل سے ملتا ہو۔ اس منافقانہ روش کو وہ زیادہ دیر برداشت نہیں کرتا۔ جب کوئی قوم اُس کے ساتھ محبت کا دم بھرتے ہوئے اُس سے بے تعلق ہو جاتی ہے تو پھر وہ بے نیاز ذات بھی اس سے قطعی طور پر مُنہ موڑ لیتی ہے اور اُس کی جگہ کسی اور قوم کو اپنی محبت کا تاج و تخت عطا کر دیتی ہے جیسا کہ اُس نے ہمیشہ کیا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۔

اور تمہارا پروردگار بے پروا اور فیاض ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لیگا اور تمہارے بعد کسی دوسری جماعت کو کھڑا کر دیگا جس طرح کہ خود تم کو دوسروں میں سے اس نے منتخب کیا تھا۔

اگر مُسلم قوم کو اب اللہ کی رضا اور خوشنودی سے زیادہ اپنی خواہشات عزیز ہیں اور اُس سے تعلقِ خاطر پیدا کرنے کی بجائے وہ اب اس کے باغیوں سے رشتۂ اتحاد قائم کرنے کی متمنی ہے اور اُس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کی بجائے اب وہ دوسرے سہاروں کی تلاش میں سرگرداں ہے تو اُسے یقین کرنا چاہیے کہ قادرِ مطلق بھی اُس کا محتاج نہیں وہ جب چاہے گا تو اپنے دین کی خدمت کے لیے کچھ دوسرے لوگوں کو منتخب کر لیگا!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ يُجَاهِدُونَ فِي

اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص دینِ حق کی راہ سے پھر جائے گا تو اُسے یقین کرنا چاہیے کہ خدا اپنے کلمۂ حق کے لیے اس کا محتاج نہیں قریب ہے کہ وہ ایک دوسری قوم کو نمایاں کرے جو اللہ کو چاہنے والی ہوگی اور اللہ اسے پیار کریگا

(باقی صـ ۴۸ پر)

چند نئی مطبوعات

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

الجہاد فی الاسلام

اسلام میں جہاد کی اہمیت اور اس کی حقیقت۔ اس کے شرائط و حدود بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ کا اسلامی قوانینِ جنگ سے تقابل۔ اردو زبان میں جہاد کے موضوع پر پہلی جرأت مندانہ اور تحقیقی کتاب صفحات ۵۳۶ قیمت مجلد ۱۱/۵۰ روپے

پردہ

تمدنی زندگی میں عورت کا صحیح مقام۔ عورت اور مرد کے دائرہ ہائے کار کا تعین۔ مخلوط سوسائٹی کا اجتماعی زندگی پر اثر۔ اسلام میں پردہ کے احکام اور اس کے حدود و شرائط۔ اپنے موضوع پر ایک معرکۃ الآرا اور بے مثل کتاب۔ صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد ۵/۵۰ روپے سستا ۲/۵۰ روپے

اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات

اسلامی نظامِ زندگی کی ضرورت۔ اس کے بنیادی تقاضے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ۔ زندگی کے دوسرے نظاموں سے اس کی برتری اور وجہ امتیاز۔ سوتے ہوئے جذبات کو جھنجھوڑنے والی ایک انقلاب آفریں کتاب قیمت مجلد ۹/- سستا ۴/-

اسلامی ریاست

اسلام کے سیاسی نظریہ کی مستند تشریح۔ اسلامی ریاست کا ایک واضح تصور۔ علمِ سیاست پر اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب۔ علماء و طلباء قانون و سیاست کے لیے ایک گرانقدر خزینۂ علم۔ پاکستان میں تدوینِ دستور کی تاریخ کا ایک اہم باب۔ صفحات ۷۲۰ قیمت مجلد ۱۲/- روپے سستا ۱۰/-

تفہیمات

اہم اسلامی مسائل پر علمی اور تحقیقی بحث۔ انبیاء علیہم السلام کی سیرت پر لگائے جاتے بے ہودہ الزامات کا مدلل جواب۔ تفسیلِ آیات۔ توضیحِ احادیث اور اعتراضات کے جوابات۔ نبوتِ محمدی کے اثبات و اتباع و اطاعت پر سیر حاصل بحث۔ حصہ اول قیمت مجلد ۵/- سستا ۵/- حصہ دوم اعلیٰ ایڈیشن قیمت

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۱۱۔ سی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور